آسان اُصولِ تفسیر

جس میں قرآن مجید کی جمع وتدوین اور مختلف عہد میں ہونے والی تسہیل تلاوت کی مساعی، تفسیر قرآن کی تعریف، عہد بہ عہد اس علم کا ارتقاء اور مختلف منہج کی اہم تفسیری کتابوں کے تعارف، تفسیر قرآن مجید کے اُصول وقواعد، تفسیر بالرائے اور تفسیر کی شرطوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز ہر بات عام فہم زبان واُسلوب میں اور مستند ماٰخذ سے استفادہ کرتے ہوئے کہی گئی ہے، دینی مدارس کے طلبہ وطالبات اور اصحابِ ذوق کے لئے یکساں مفید اور قابل مطالعہ۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

باہتمام

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ناشر

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور، یوپی

اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَهٗ ﴿۱۹﴾ (القیامة: ۱۷-۱۹)

یقیناً ہم ہی کے ذمہ اس قرآن مجید کو جمع کرنا اور اس کو پڑھنا ہے، پھر جب ہم پڑھیں تو آپ اس کی پیروی کیجئے، پھر ہم ہی پر اس کتاب کی وضاحت کی بھی ذمہ داری ہے۔

فہرست مضامین

تفسیر قرآن مجید

اُصولِ تفسیر

● ● ●

عرضِ مؤلف

اس حقیر پر اللہ تعالیٰ کے جو بے پناہ احسانات ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو گذشتہ تقریباً چھتیس سالوں سے علومِ اسلامی کی تدریس کا شرف حاصل ہے اور درسِ نظامی میں مروج کم و بیش تمام ہی فن کی بیش تر کتابوں کو پڑھانے کا موقع ملا ہے، ان ہی تجربات کے تحت عرصہ پہلے ''آسان اُصولِ حدیث'' اور ''آسان اُصولِ فقہ'' مرتب کرنے کا شرف حاصل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مدارس کے حلقہ میں ان کتابوں کو شرفِ قبولیت سے بھی نوازا؛ اسی وقت سے خواہش تھی کہ ''آسان اُصولِ تفسیر'' پر بھی مختصر رسالہ مرتب ہوجائے جو ترجمہ قرآن پڑھنے والے طلبہ کو پڑھایا جائے اور یہ ان کی مادری زبان میں ہو، یہ کام اس لئے بھی ضروری تھا کہ اُصولِ تفسیر پر عربی زبان میں جو کتابیں ہیں، وہ بہت طویل اور مفصل ہیں اور درسِ نظامی کے موجودہ ڈھانچہ میں اس پوری کتاب کو پڑھایا جانا دشوار ہے۔

حضرت مولانا عبد الصمد رحمانیؒ نے غالباً اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ سیوطیؒ کی ''الاتقان فی علوم القرآن'' کی تلخیص مرتب کی تھی، مگر اب وہ نایاب ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ''الفوز الکبیر'' داخل نصاب ہے اور پڑھائی بھی جاتی ہے، یہ کتاب اگر چہ شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح منفرد شان کی حامل ہے اور ایک نئے انداز سے اس میں اُصولِ تفسیر کو پیش کیا گیا ہے؛ لیکن علوم قرآن اور اُصولِ تفسیر کے تمام مباحث اس میں شامل نہیں ہیں، اُردو زبان میں اس موضوع پر ایک بہت ہی فاضلانہ تالیف حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کی علوم القرآن ہے، مگر یہ کتاب نصابی نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی ہے؛ بلکہ ''معارف القرآن'' (حضرت مولانا محمد شفیعؒ) کے مقدمہ کے طور پر علماء اہل دانش کے لئے مرتب ہوئی ہے۔

ان اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے خواہش تھی کہ یہ رسالہ بھی جلد مرتب ہوجائے؛ لیکن موقع نہیں مل پارہا تھا، آخر جب ''آسان تفسیر قرآن مجید'' کا کام شروع ہوا تو اور زیادہ اس ضرورت کا احساس ہوا، جو اس ترجمہ کا مقدمہ بھی بن جائے اور کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ایک نصابی کتاب کی حیثیت سے بھی الگ سے شائع ہوجائے؛ چنانچہ شوال ۱۴۳۴ھ میں یہ تحریر مرتب کی گئی، جو ''آسان تفسیر قرآن مجید'' میں مقدمہ کے طور پر شامل ہوئی؛ البتہ ''آسان اُصولِ تفسیر'' میں نصابی نقطۂ نظر سے حذف واضافہ سے کام لیا گیا ہے، قرآن مجید سے متعلق فقہی احکام کا حصہ — جو تفسیر کے مقدمہ میں تھا — حذف کردیا گیا ہے؛ کیوں کہ طلبہ کے لئے اس کی ضرورت نہیں تھی، وہ عوامی نفع کے پیش نظر لکھا گیا تھا، ''سبعۃ اُحرف'' (سات حروف) کی بحث کی عام لوگوں کو ضرورت نہیں تھی؛ اس لئے مقدمہ میں اس کو شامل نہیں رکھا گیا، البتہ اِس کتاب میں اس کا اضافہ کردیا گیا ہے، نصابی نقطۂ نظر سے اس کتاب میں تمرینات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے اور ایک آدھ جگہ چھوٹی موٹی تصحیحات بھی ہیں۔

بنیادی طور پر اس کتاب میں تین مباحث شامل ہیں، اول: قرآن مجید کی جمع و ترتیب، اس کے مضامین، تسہیل تلاوت کی کوششیں اور اعجازِ قرآن وغیرہ، دوسرے: تفسیر قرآن مجید کی تاریخ اور مختلف تفسیری مناہج کا تعارف، تیسرے تفسیر کے مآخذ اور اس کے اُصول وشرائط، یہی اصل میں 'اُصولِ تفسیر' کا باب ہے، اُصولِ تفسیر کا بہت کچھ تعلق اُصولِ فقہ سے بھی ہے کیوں کہ اُصولِ فقہ میں ایک اہم اور تفصیلی بحث الفاظ کی اپنے معنی پر دلالت سے متعلق ہے، عام، خاص، مطلق، مقید، ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل، مجمل، متشابہ، عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص، امر و نہی اور حروف معانی وغیرہ سے متعلق مباحث اسی ذیل میں آتے ہیں، اس لئے اُصولِ تفسیر پڑھنے پڑھانے والے طلبہ واساتذہ کی نظر ان مباحث پر بھی ہونی چاہئے۔

کوشش کی گئی ہے کہ تمام مضامین فن کی معتبر اور اہم کتابوں سے مستفاد ہوں اور جہاں کہیں عصری معلومات کی ضرورت ہے، وہاں معاصر عرب وعجم اہل علم سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، خدا کرے آسان اُصولِ حدیث اور آسان اُصولِ فقہ کی طرح اس سلسلہ کی یہ کوشش بھی اہل علم کی

بارگاہ میں قبولیت حاصل کرے، طالبانِ علوم اسلامی کے لئے نفع کا ذریعہ بنے اور کتاب اللہ کی نسبت سے انجام دی جانے والی یہ حقیر خدمت آخرت میں سرخ روئی کا ذریعہ بنے۔

اب اس سلسلہ کی ایک اور تحریر پیش نظر ہے، اور وہ ہے: آسان علم کلام، جس میں اہل سنت والجماعت کے ماثور عقائد اور موجودہ زمانہ میں پیدا ہونے والے فرق باطلہ کے افکار کا رد اختصار کے ساتھ آجائے اور خود اہل سنت والجماعت کے اندر جو مختلف دبستانِ فکر پائے جاتے ہیں، ان کے مابین جو جزوی اختلاف ہے، وہ بھی واضح ہوجائے، دُعا ہے کہ وقت بھی میسر ہو اور توفیق خداوندی بھی، **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

۱ر رجب ۱۴۳۵ھ	**خالد سیف اللہ رحمانی**
۱ر مئی ۲۰۱۴ء	(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

●●●

قرآن مجید کے نام

قرآن مجید کا اصل نام ''قرآن'' ہے، خود قرآن مجید نے اپنے لئے ستر بار اس نام کا استعمال کیا ہے، — عربی قواعد کے لحاظ سے اس لفظ کا ماخذ کیا ہے؟ اس سلسلہ میں تین اقوال نقل کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس کا مادہ ''ق، ر، ء'' ہے، جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، یعنی ایسی کتاب جو خوب اور بار بار پڑھی جائے گی، زیادہ تر اہل علم کی یہی رائے ہے، خود قرآن مجید کے ارشاد: ''**إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ**'' (القیامۃ: ۱۷-۱۸) سے اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی اصل ''ق، ر، ن'' ہے، جس کے معنی ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کے ہیں؛ کیوں کہ قرآن مجید کے مضامین ایک دوسرے کے مشابہ، باہم مربوط اور اختلاف و تعارض سے خالی ہیں، یہ رائے علامہ ابوالحسن اشعری ؒ کی طرف منسوب ہے، تیسرا قول امام شافعی ؒ کا ہے کہ قرآن کا لفظ کسی اور لفظ سے مشتق نہیں ہے؛ بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کا علَم اور نام ہے، جیسا کہ تورات حضرت موسیٰ ؑ پر اُترنے والی اور انجیل حضرت عیسیٰ ؑ پر اُترنے والی کتاب کا نام ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کے جو نام ذکر کئے گئے ہیں، وہ دراصل قرآن کی ''صفات'' ہیں، بعض اہل علم نے ''کتاب'' اور ''فرقان'' کو بھی اسماء قرآن میں شمار کیا ہے؛ لیکن قرآن مجید میں تورات کو بھی ''کتاب'' اور ''فرقان'' کہا گیا ہے: ''**وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ**'' (البقرۃ: ۵۳، نیز دیکھئے: الانبیاء: ۴۸) — اس لئے حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا نام ''قرآن'' ہی ہے، اور جن دوسرے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ قرآن کی صفات ہیں نہ کہ اسماء۔

تعریف

اصطلاح میں قرآن مجید کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے، جس کے الفاظ محمد ﷺ پر نازل کئے گئے ہیں، جو تواتر کے ساتھ منقول ہے، جس کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے ہوتی ہے اور جو سورۂ ناس پر ختم ہوتا ہے۔

- ''الفاظ کے نازل کئے جانے'' سے حدیث نکل گئی، خواہ حدیث قدسی کیوں نہ ہوں، جس میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حوالہ کے ساتھ اپنا ارشاد نقل کیا ہے؛ کیوں کہ اس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے۔
- ''محمد ﷺ پر نازل کئے جانے'' سے گذشتہ آسمانی کتابیں خارج ہوگئیں؛ کیوں کہ وہ دوسرے پیغمبروں پر نازل کی گئی ہیں۔
- ''تواتر کے ساتھ نقل کئے جانے'' کا مطلب یہ ہے کہ اتنے لوگوں نے اس کو نقل کیا ہے کہ بہ ظاہر ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہیں، اس سے شاذ قراءتیں یا حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کی طرف منسوب بعض شاذ اقوال نکل گئے۔

سورۂ فاتحہ سے ابتداء اور ''سورۂ ناس پر اختتام'' سے قرآن مجید کا مزید تعارف ہوتا ہے۔

نزولِ قرآن

قرآن مجید تین مرحلوں میں نازل ہوا ہے :

(۱) سب سے پہلے ''لوحِ محفوظ'' پر اُتارا گیا: ''**بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ، فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ**'' (بروج: ۲۱-۲۲) ''بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے، اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے'' اسی کو دوسری جگہ 'کتاب مکنون' کہا گیا ہے: ''**إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ، فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ**'' (الواقعۃ: ۷۷-۷۸) ''یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے''۔

(۲) دوسرا نزول آسمانِ دنیا کی طرف ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**إِنَّا**

أَنزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ " (دخان:۳) "ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے" نیز فرمایا گیا: "إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ " ۔ (القدر:۱)

(۳) تیسرا مرحلہ آپ ﷺ پر نازل کئے جانے کا ہے، جس کی تکمیل تقریباً ۲۳ سال کے عرصہ میں ہوئی ہے۔

نزولِ قرآن مجید کی کیفیت

رسول اللہ ﷺ پر نزولِ قرآن مجید کی بنیادی طور پر دو کیفیتیں ہوتی تھیں :

(۱) اللہ تعالیٰ نے براہ راست آپ ﷺ پر القاء فرمایا اور یہ صرف سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، جو واقعۂ معراج کے موقع پر نازل ہوئیں، حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے؛ البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام حجاب کے واسطہ سے تھا، بالمشافہ نہیں تھا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام فرشتہ کے ذریعہ آپ ﷺ پر بھیجا ہے۔

قرآن مجید میں وحی کے ان دونوں طریقوں کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۔ (الشوریٰ:۵۱)

کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے، اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے، جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی کرتا ہے، وہ برتر اور حکیم ہے۔

آپ ﷺ پر وحی نازل کئے جانے کے لئے جس فرشتہ کا انتخاب کیا گیا، وہ ہیں: حضرت جبرئیل — حضرت جبرئیل ؑ کے آپ ﷺ پر وحی نازل کرنے کی تین صورتیں تھیں :

(۱) وہ اَن دیکھی شکل میں آتے، جب آپ ﷺ پر وحی پیش فرماتے تو گھنٹے بجنے کی

یا مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز آتی۔

(۲) کسی انسانی شکل میں آتے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں آتے ہیں تو زیادہ تر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آتے ہیں اور یہ مجھ پر سب سے آسان صورت ہوتی ہے۔

(۳) حضرت جبرئیل اپنی اصل شکل میں نظر آتے، ایک بار مقام 'اجیاد' پر آپ نے حضرت جبرئیل کو ان کی اصل شکل میں دیکھا ہے (۱)؛ چنانچہ جمہور کے نزدیک "**راٰه بالأفق المبين**" (التکویر: ۲۳) سے حضرت جبرئیل ہی کو ان کی اصل صورت میں دیکھنا مراد ہے۔

"انبیاء" پر وحی کی دو اور صورتیں بھی ہیں، جن میں ایک صورت خواب کی تھی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کرتے ہوئے دیکھا (۲) یا رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب ہی کو پیش نظر رکھ کر صحابہ کو عمرہ کے لئے کوچ کرنے کا حکم فرمایا، جس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔

دوسری صورت وہ ہے جس کو حدیث میں: "**نفث في الروع**" (۳) سے تعبیر کیا گیا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

إن روح القدس نفث في روعي أنه لن تموت نفس حتى تستكمل رزقها وأجلها ، فاتقوا الله وأجملوا في الطلب۔ (۴)

لیکن آپ ﷺ پر ان دونوں طریقوں سے "وحی غیر متلو" کا نزول ہوا ہے، جس کو آپ ﷺ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور جس کو ہم "حدیث" سے تعبیر کرتے ہیں، قرآن مجید کی کوئی آیت اس طریقہ پر نازل نہیں ہوئی ہے۔

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۹/۲۴۱، وکذا فی فتح القدیر: ۵/۵۵۲۔

(۲) صافات: ۱۰۱-۱۰۳۔

(۳) فتح الباری: ۱/۳۰۔

(۴) ابونعیم فی الحلیۃ بسند صحیح، جلد نمبر: ۱۰/۲۷، نیز دیکھئے: مصنف ابن شیبہ، کتاب الزہد، حدیث نمبر: ۳۴۳۳۲۔

تمرینی سوالات

(۱) قرآن مجید کا مادہ اشتقاق کیا ہے اور اس کا اصل نام کیا ہے؟

(۲) قرآن مجید کی اصطلاحی تعریف کیجئے اور فوائد قیود کو واضح کیجئے۔

(۳) قرآن مجید کا نزول کن مراحل میں ہوا؟

(۴) رسول اللہ ﷺ پر نزولِ قرآن کی بنیادی طور پر کیا کیفیت ہوتی تھی؟

(۵) حضرت جبرئیل ؑ آپ ﷺ پر کس طرح وحی لایا کرتے تھے؟

(۶) نزولِ وحی کی اور کیا کیفیتیں ہوا کرتی تھیں؟

قراءتیں

رسول اللہ ﷺ پر نہ صرف قرآن مجید کے الفاظ نازل کئے گئے؛ بلکہ ان کی ادائیگی کا لب ولہجہ بھی آپ ﷺ پر پیش فرمایا گیا؛ چنانچہ ارشاد ہے: ''**فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ**''(۱) لیکن ایک ہی لفظ کی ادائیگی کے لئے عرب کے مختلف قبائل کے درمیان اُسلوب کا کسی قدر فرق پایا جاتا تھا، قرآن مجید کو ان تمام لہجوں میں ادا کرنے کی اجازت دی گئی، یہی مختلف لہجے ''قراءت'' کہلاتے ہیں۔

قراءت کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

العلم بکیفیة اداء کلمات القرآن الکریم واختلافها منسوبة لناقلها۔ (۲)

قراءت اس علم کا نام ہے، جس سے قرآن کریم کے کلمات کی ادائیگی کی کیفیت اور نقل کرنے والے کی نسبت کے ساتھ اس سلسلہ میں اختلافات کا علم ہوتا ہے۔

---

(۱) القیامۃ: ۱۷۔ (۲) منجد المقرئین لابن الجوزی: ۶۱۔

رسول اللہ ﷺ مختلف عرب لہجوں میں قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، صحابہ ان مختلف لہجوں کے ناقل اول تھے، خلفاء راشدین، حضرت اُبی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ کو اس سلسلہ میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، پھر تابعین کے ذریعہ اس فن کی ترویج واشاعت ہوئی، تابعین میں یزید بن قطاع، عبدالرحمن اعرج، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطاء، حسن بصری، علقمہ، اسود نخعی، زید بن حُبیش ﷺ اور مسروق وغیرہ کا اس علم میں نمایاں رول رہا ہے۔

پہلی دفعہ ان مختلف قراءتوں کو جس شخصیت نے فنی طور پر مرتب کیا، وہ ہیں: ابوعبید قاسم بن سلاّم (م: ۲۳۴ھ)، انھوں نے بیس قراءتوں کو جمع کیا، پھر بعد کو بھی اس میں کمی واضافہ کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ امام ابوبکر احمد بن موسیٰ بن عباس بن مجاہد تمیمی (متوفی: ۳۲۴ھ) نے سات معروف ومتواتر قراءتوں کو مرتب کیا اور "**کتاب السبعة فی القراءات**" تالیف فرمائی، بنیادی طور پر جن صحابہ سے یہ قراءتیں مستفاد ہیں، نیز جو امام قراءت اس کے ناقل ہیں، پھر ان سے جن شاگردوں نے اس کو اخذ کیا ہے اور ان کے ذریعہ اس کی اشاعت ہوئی ہے، اس کو ذیل کے نقشہ میں دیکھا جا سکتا ہے:

☆ **حضرت علی کرم اللہ وجہہ**

ائمۂ قراءت	ائمہ کے مشہور تلامذہ
● عاصم بن ابی نجود کوفی (م: ۱۲۷ھ)	● حفص بن سلیمان (م: ۱۸۰ھ) ● شعبہ بن عیّاش (م: ۱۹۳ھ)

☆ **حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ**

ائمۂ قراءت	ائمہ کے مشہور تلامذہ
● حمزہ بن حبیب کوفی (م: ۱۵۶ھ)	● خلّاد بن خالد (م: ۲۲۰ھ) ● خَلَف بن ہشام (م: ۲۲۹ھ)
● علی بن حمزہ کسائی (م: ۱۶۹ھ)	● حفص بن عمرو دُوری (م: ۲۴۶ھ) ● ابوالحارث لیث بن خالد (م: ۲۴۰ھ)

☆ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ

ائمہ قراءت	ائمہ کے مشہور تلامذہ
● عبداللہ بن عامر شامی (م:۱۱۸ھ)	● ہشام بن عامر دمشقی (م:۲۴۵ھ) ● عبداللہ بن احمد، معروف بہ ابن ذکوان (م:۲۴۲ھ)

☆ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

● عبداللہ بن کثیر مکی (م:۱۲۰ھ)	● محمد بن عبدالرحمن قُنبل (م:۲۹۱ھ) ● احمد بن محمد بزّی (م:۲۵۰ھ)

☆ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

● ابوعمرو زبان بن علاء بصری (م:۱۵۴ھ)	● حفص بن عمرو دُوری (م:۲۴۶ھ) ● صالح بن زیاد السُّوسیؒ (م:۲۶۱ھ)
● نافع عبدالرحمن مدنی (م:۱۲۰ھ)	● عیسیٰ بن مینا، معروف بہ ''قالون'' (م:۲۲۰ھ) ● عثمان بن سعید، معروف بہ ''وَرش'' (م:۱۹۷ھ)

پھر علامہ ابن الجزری نے اس میں مزید تین قراءتوں کا اضافہ کیا ہے، ان ائمہ قراءت کے نام اس طرح ہیں :

☆ امام ابو جعفر یزید بن قعقاع مدنی (م:۱۳۰ھ)

تلامذہ : ● ابن وَرْدَان (م:۱۶۰ھ)	● ابن جُمّاز (م:۱۷۰ھ)

☆ امام یعقوب بن اسحاق حضرمی کوفی (م:۲۰۵ھ)

تلامذہ : ● رُوَیس (م:۲۳۸ھ)	● رَوح (م:۲۳۵ھ)

☆ امام خلف بن ہشام (م:۲۲۹ھ)

تلامذہ : ● اسحاق (م:۲۸۶ھ)	● ادریس (م:۲۹۲ھ، ولادت:۲۰۰ھ)

ان تینوں قراءتوں کو ملا کر ''قراءات عشرہ'' کہا جاتا ہے، امام قراءت سے جو طریقہ

منسوب ہوتا ہے، اس کو ''قراءت'' کہتے ہیں اور جس نے ان سے نقل کیا ہو، اس کو ''روایت'' کہتے ہیں، جیسے: قراءتِ عاصم بہ روایتِ حفص، یا قراءتِ نافع بہ روایتِ ورش، وغیرہ۔

بہت سی قراءتوں میں سے ان سات یا دس قراءتوں کے انتخاب کے لئے بنیادی طور پر اہل علم نے تین معیارات مقرر کئے ہیں :

(۱) وہ قراءت تواتر کے ساتھ منقول ہو — جو شاذ قراءت ہو اس کا اعتبار نہیں، جیسے: ''وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ'' (البقرۃ:۲۳۷) حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ سے ''ولا تناسوا'' منقول ہے، مگر یہ روایت شاذ ہے۔

(۲) وہ قراءت مصاحف عثمانی کے دائرہ میں آتی ہو — جیسے: ''مالک یوم الدین'' مصحف عثمانی میں اس لفظ کو ''ملک'' لکھا گیا ہے، جس کو ''مالک'' بھی پڑھا جاسکتا ہے اور ''ملک'' بھی — اگر مصحف عثمانی سے مختلف ہو تو اس کا اعتبار نہیں، جیسے: حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کی قراءت میں ''وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ'' (اللیل:۳) کی بجائے صرف ''والذکر والانثی'' منقول ہے، یہ مصحف عثمانی کے خلاف ہے۔

(۳) وہ عربی زبان کے قواعد کے موافق ہو، جیسے: ''وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ'' (النساء:۱) — اس میں امام حمزہ کی روایت ''م'' کے زیر کے ساتھ ''والارحامِ'' ہے، مگر یہ معتبر ہے؛ کیوں کہ یہ عربی قواعد کے مغائر نہیں ہے۔

جو قراءتیں ان معیارات پر پوری اُترتی ہوں، ان ہی کا اعتبار ہے۔

موجودہ دور میں پوری دنیا میں تین قراءتیں مقبول و معمول ہیں :

(۱) قراءتِ عاصم بہ روایت حفص: خلیجی ممالک، برصغیر، ترکی، افغانستان، مصر اور تمام مشرقی ممالک۔

(۲) قراءتِ نافع بہ روایت وَرش: تیونس، جزائر، سوڈان، مغرب اقصی اور مصر کے بعض علاقے۔

(۳) قراءتِ نافع بہ روایت قالون: تیونس، مصر اور لیبیا کے بعض علاقے۔

سات حروف

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

إن هذا القرآن أنزل على سبعة أحرف ، فاقرؤوا ما تيسر منها ۔ (۱)

یقیناً قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے؛ لہٰذا جس طرح آسانی ہو پڑھو۔

اس حدیث میں سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، ان میں سے دو رائیں زیادہ اہم ہیں :

(۱) اس سے مراد عربوں کی لغات میں سے سات لغتیں ہیں — یعنی قرآن مجید نازل تو ہوا تھا قریش کی لغت میں ؛ لیکن بعض مفہوم کو مختلف قبائل کے لوگ الگ الگ الفاظ سے تعبیر کیا کرتے تھے، ابتدائی دور میں تمام لوگوں کو ایک ہی لغت کا پابند بنانا ان کے لئے دشواری کا باعث تھا؛ اس لئے انھیں اپنی اپنی لغت کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی، جیسے ایک ہی مفہوم کو بیان کرنے کے لئے کوئی قبیلہ ''**أَقْبِلْ**'' کا لفظ بولتا، کوئی ''**تعال**'' کوئی ''**هَلُمَّ**'' وغیرہ، اس کی تائید حضرت ابوبکر سے منقول اس روایت سے ہوتی ہے :

... أن جبريل قال : يا محمد ! إقرأ القرآن على حرف ، فقال ميكائيل : استزده ، فقال : على حرفين ، حتى بلغ ستة أو سبعة أحرف ، فقال : كلها شاف كاف ، مالم يغير آية عذاب بآية رحمة ، أو آية رحمة بآية عذاب كقولك : هلم ، وتعال ، وأقبل ، واذهب ، وأسرع ، وعجل ۔

---

(۱) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب أنزل القرآن علی سبعۃ احرف، حدیث نمبر: ۴۷۰۶۔

(۲) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۰۵۳۳۔

حضرت جبرئیل ﷺ نے (حضور ﷺ سے) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک حرف پر پڑھیے، میکائیل ﷺ نے کہا: اس میں اضافہ کروائیے، یہاں تک کہ معاملہ چھ یا سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبرئیل ﷺ نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک شافی وکافی ہے، جب تک آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے بدل نہ دیں، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے: آپ تعال (آؤ) کے معنی کو اقبل، ہلم، اذہب، اسرع اور عجل کے الفاظ سے ادا کریں۔

اسی طرح ابوبکر اعمش نقل کرتے ہیں:

قرأ أنس هذه الآية: ''إن ناشئة الليل هى أشد وطأً وأصوب قيلا'' فقال له بعض القوم: يا أباحمزة! إنما هى ''وأقوم'' فقال: أقوم وأصوب وأهيأ واحد۔ (۱)

حضرت انس ﷺ نے آیت پڑھی: **''إن ناشئة الليل هى أشد وطأً وأصوب قيلا''** تو کسی نے کہا: اے ابوحمزہ! ''وأصوب'' نہیں، ''وأقوم'' ہے، تو حضرت انس نے فرمایا: أقوم''، ''أصوب''، ''أهيأ'' سب ایک ہی معنی میں ہیں۔

غرض کہ ہر لفظ میں تو سات حروف نہیں ہیں؛ لیکن بحیثیت مجموعی عرب کے سات بڑے قبائل —— جن کی زبان کو قبول عام حاصل تھا —— ان کی تعبیر کے مطابق قرآن پڑھنے کی گنجائش رکھی گئی تھی، یہ رائے سفیان بن عیینہ، ابن جریر طبری، ابن وہب اور بہت سے اہل علم کی ہے اور علامہ ابن عبدالبر کے قول کے مطابق یہی اکثر اہل علم کی رائے ہے، (۲) —— البتہ جب

---

(۱) طبری، ابویعلی، حدیث نمبر: ۴۰۲۲۔

(۲) مباحث فی علوم القرآن لمناع القطان: ۱۶۲۔

عرب لغت قریش پر قرآن کی تلاوت کے عادی ہو گئے تو یہ سہولت ختم کردی گئی؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے قرآن کریم کا جو آخری دور سنایا، وہ صرف لغت قریش میں ہوا، جس کے مطابق قرآن مجید نازل ہوا تھا۔(۱)

دوسری رائے یہ ہے کہ سات حروف سے مراد قراءت کی مختلف نوعیتیں ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث کا فرق، جیسے: ''**لاماناتھم**'' (مومنون:۸) اور ''**لامانتھم**''۔

(۲) افعال، یعنی: ماضی، مضارع اور امر کا فرق، جیسے: ''**رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا**'' (سباء:۱۹) یعنی ''ربنا'' منادی اور ''باعد'' فعل امر، اور دوسری قراءت ''ربنا باعَدَ'' یعنی ''ربنا'' مبتدا اور ''باعد'' فعل ماضی۔

(۳) اعراب، یعنی: زبر، زیر، پیش کا اختلاف، جیسے: ''**وَلاَ يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلاَ شَهِيْدٌ**'' (البقرۃ:۲۸۲) میں راء کے زبر کے ساتھ ''**لا یضار**'' کی قراءت بھی ہے، ایسی صورت میں ''لا'' نہی کے لئے ہوگا اور راء کے پیش کے ساتھ ''لا یضارُّ'' کی قراءت بھی ہے، ایسی صورت میں ''لا'' نافیہ ہوگا۔

(۴) کسی لفظ کی کمی اور زیادتی کا اختلاف، جیسے: ''**وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى**'' (اللیل:۳) اور دوسری قراءت کے مطابق ''**والذکر والانثی**'' اس میں ''**ما خلق**'' کا لفظ کم ہو گیا ہے۔

(۵) کسی قراءت میں ایک لفظ کا پہلے ہونا اور کسی میں اس کا بعد میں ہونا، جیسے: ''**وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ**'' (ق:۱۹) اور دوسری قراءت کے مطابق ''**وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ**''۔

(۶) حروف کے بدل جانے کا اختلاف، جیسے: ''**وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا**'' (البقرۃ:۲۵۹) اور دوسری قراءت کے مطابق ''**ننشرھا**''۔

---

(۱) مشکل الآثار للطحاوی: ۱۸۶/۴۔

(۷) لہجوں کا اختلاف، جیسے فتح اور امالہ، یا ترقیق، یا اظہار وادغام کا فرق، جیسے:
''**هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى**'' (نازعات:۱۵) میں ایک قراءت ''أتیٰ'' اور ''موسیٰ'' میں امالہ کی بھی ہے، جس میں ''اُتے'' اور ''موسے'' پڑھا جاتا ہے۔

اس رائے کے قائل علامہ ابن قتیبہ، مشہور عالم قراءت ابن جزری اور ممتاز فقیہ امام مالک ہیں؛ البتہ ان سات نوعیتوں کی تعیین میں کسی قدر اختلاف ہے، اوپر اختلاف کی جو نوعیتیں ذکر کی گئی ہیں، وہ امام ابوالفضل رازی سے منقول ہیں، (۱) — شیخ محمد عبدالعزیز زرقانی نے بھی اسی قول کو ترجیح دیا ہے اور اس قول کے راجح ہونے اور دوسرے اقوال کے درست نہ ہونے پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ (۲)

تمرینی سوالات

(۱) قرأت کی اصطلاحی تعریف کیا ہے؟

(۲) علم قرأت میں کن صحابہ وتابعین کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، بحیثیت مجموعی کم سے کم دس شخصیتوں کے نام ذکر کیجئے۔

(۳) قرأت سبعہ سے کن کن ائمہ قرأت کی قرأتیں مراد ہیں اور انھوں نے کن صحابہ سے کسبِ فیض کیا تھا؟

(۴) قرأت عشرہ میں کن تین قرأتوں کا اضافہ کیا گیا ہے؟

(۵) قرأت سبعہ اور بقیہ تین قرأتوں کے مرتب کون ہیں؟

(۶) قرأتوں کے انتخاب کے لئے اہل علم نے کیا معیارات مقرر کئے ہیں؟

(۷) اس وقت دنیا میں جو تین قرأتیں مقبول ہیں، وہ کن ائمہ کی ہیں، ان کے راوی کون ہیں اور کن علاقوں میں ان کا رواج ہے؟

(۸) ''**إن هذا القرآن انزل على سبعة احرف**'' اس میں راجح قول کے مطابق کونسے سات حروف مراد ہیں؟

---

(۱) مناہل العرفان: ۱/۱۵۱۔ (۲) حوالہ سابق۔

اسبابِ نزول

قرآن مجید کا اصل موضوع انسانیت کی ہدایت ہے اور قرآن کی تمام آیات بنیادی طور پر اسی مقصد کے تحت نازل ہوئی ہیں؛ لیکن بعض آیات کسی خاص واقعہ کے پس منظر میں اُتاری گئی ہیں، اس واقعہ کو "سببِ نزول" کہا جاتا ہے۔

اسبابِ نزول کی اہمیت

قرآن مجید کے مقصد و منشاء کو سمجھنے کے لئے اسبابِ نزول کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

● لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّآمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّأَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (المائدۃ:۹۳)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا تو اس سے پہلے وہ جو کچھ کھا چکے ہیں، اس سلسلہ میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، جب کہ انھوں نے گناہ کو چھوڑ دیا، ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے، پھر گناہوں سے بچتے رہے اور ایمان لائے، پھر گناہوں سے پرہیز کرنے پر قائم رہے اور نیک عمل کیا، اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ آیت شراب کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اس آیت کی وجہ سے شراب کو مباح خیال کرتے تھے؛ لیکن اس غلط فہمی کا ازالہ اس کے سببِ نزول سے ہوتا ہے، اس کا شانِ نزول منقول ہے کہ جب شراب کے حرام ہونے کی آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے بعض بھائیوں کی اس حال میں وفات ہوئی ہے کہ شراب ان کے پیٹ میں تھی اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ شراب ناپاک ہے :

• إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالأَنصَابُ وَالأَزْلاَمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ (المائدة:۹۰)

بے شک شراب، جوا، مورتیاں اور فال نکالنے کے تیر گندی باتیں ہیں اور شیطانی کام ہیں، ان سے بچو؛ تاکہ تمہارا بھلا ہو۔

اس موقع پر مذکورہ آیت نازل ہوئی کہ حرام ہونے سے پہلے جو لوگ ان چیزوں کو کھا پی چکے ہیں، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

• وَلِلّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجْهُ اللّهِ ۔ (البقرة:۱۱۵)

اور مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے، تم جس طرف بھی منہ کرو، اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے۔

اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سفر ہو یا حضر، قبلہ کا استقبال واجب نہیں ہے، کسی بھی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات اجماع کے خلاف ہے، اس آیت کا سببِ نزول یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک تاریک رات میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، ان کو قبلہ کی جہت کا اندازہ نہیں ہو سکا، ہر ایک نے اپنے اجتہاد کے اعتبار سے رُخ متعین کر کے نماز ادا کر لی، ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، گویا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی انسان پر قبلہ مشتبہ ہو جائے اور سمت کا اندازہ نہ ہو سکے تو وہ اپنی تحری (میلانِ قلب) پر عمل کرے گا؛ کیوں کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہے اور تمام سمتیں اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔

اسبابِ نزول کی اسی اہمیت کی وجہ سے مفسرین نے ان کو نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے، علی ابن مدینی استاذ امام بخاری، حافظ ابن حجر، علامہ واحدی اور علامہ سیوطی نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے علامہ واحدی کی ''اسباب النزول'' اور علامہ سیوطیؒ کی

"لباب النقول" اہم اور جامع کتابیں ہیں؛ البتہ ان کتابوں میں بکثرت ضعیف روایات بھی منقول ہیں۔

سببِ نزول سے واقف ہونے کی صورتیں

کسی واقعہ کے سبب نزول ہونے کے سلسلہ میں واقف ہونے کی دو صورتیں ہیں :

● ایک صورت یہ ہے کہ حدیث میں اس کی صراحت موجود ہو، جیسے حضرت عبداللہ بن عباس ﷠ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں چھپ کر صحابہ کرام کو نماز پڑھایا کرتے تھے، آپ ﷺ بلند آواز میں قرآن پاک پڑھتے، مشرکین جب سنتے تو قرآن کو برا بھلا کہتے، نیز قرآن مجید نازل کرنے والے اور اسے لے کر آنے والے کی شان میں گستاخی کرتے، اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو خطاب فرمایا :

وَلاَ تَجْهَرْ بِصَلاَتِكَ وَلاَ تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلاً ۔ (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

اور اپنی نماز میں نہ زیادہ بلند آواز میں پڑھو اور نہ بالکل آہستہ، اس کے درمیان کا راستہ اختیار کرو۔

یعنی قرآن مجید اتنی زور سے نہ پڑھیں کہ مشرکین سن لیں اور قرآن کو برا بھلا کہیں اور اتنا آہستہ نہ پڑھیں کہ آپ کے رفقاء بھی سن نہ سکیں، (۱) —— کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ سوال کیا جاتا، اس کے جواب میں آیت نازل ہوتی، جیسے: حضرت عبداللہ بن مسعود ﷠ سے روایت ہے کہ میں مدینہ کے ایک کھیت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا کہ یہودیوں کا ایک گروہ گذرا، ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ان سے "روح" کے بارے میں دریافت کرو، اور بعض نے کہا: مت پوچھو، کہیں ایسی بات نہ کہہ دیں، جو تم لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہو، بہر حال ان میں کچھ لوگوں نے پوچھ ہی لیا، آپ تھوڑی دیر اس طرح رُکے رہے کہ گویا انتظار میں ہوں، میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے، پھر حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی :

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۴۴۵۔

يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ ۔ (۱)

لوگ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرر ہے ہیں، آپ کہہ دیجیے: روح میرے پروردگار کے حکم سے بنی ہے۔(۲)

● کبھی سببِ نزول کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ کسی خاص واقعہ کے سبب نزول ہونے کی صراحت نہیں ہوتی؛ لیکن مضمون کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس مضمون یا اس پس منظر میں نازل ہوئی ہے، جیسے: حضرت جابر ﷛ سے روایت ہے کہ یہود کہا کرتے تھے: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے پشت کی جانب سے ہم آغوش ہوگا تو ''اُحول'' بچہ پیدا ہوگا؛ چنانچہ آیت نازل ہوئی :

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ ۔ (۳)

تمہاری بیویاں کھیتیاں ہیں تو اپنی کھیتی پر جس طرح چاہو آؤ۔(۴)

اسبابِ نزول میں اختلاف

کبھی ایک ہی آیت سے متعلق مختلف اسبابِ نزول ذکر کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک روایت سند کے اعتبار سے معتبر یا زیادہ معتبر ہوتی ہے اور دوسری غیر معتبر یا کم معتبر ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں جو روایت زیادہ معتبر طریقہ پر ثابت ہے، وہ قبول کی جائے گی، جیسے: رسول اللہ ﷺ کو کچھ تکلیف ہوگئی، آپ دو تین شب قیام لیل نہیں کر پائے، ایک عورت آئی اور اس نے کہا: اے محمد! میرا خیال ہے کہ (نعوذ باللہ) تمہارے شیطان نے تم کو چھوڑ دیا ہے اور دو تین راتوں سے تم سے دور ہو گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں :

وَالضُّحٰى ، وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى ، مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۔ (۵)

---

(۱) بنی اسرائیل: ۸۵۔ (۲) بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، حدیث نمبر: ۶۸۶۷۔

(۳) البقرۃ: ۲۲۳۔ (۴) مسلم عن جابر، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۳۶۰۸۔

(۵) سورۃ الضحیٰ: ۱-۳۔

آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی، جب چھا جائے کہ
آپ کے پروردگار نے نہ تو آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے ناراض
ہوا۔(۱)

اس کے مقابلہ میں طبرانی کی روایت ہے کہ ایک کتے کا بچہ رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ مبارک میں داخل ہوا اور آپ کی چار پائی کے نیچے مرگیا، چار دنوں تک آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی، آپ نے حضرت شعبہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ پتہ نہیں کیا بات پیش آئی ہے کہ جبرئیل نہیں آئے ہیں؛ چنانچہ انھوں نے گھر میں جھاڑو دی تو چار پائی کے نیچے سے کتے کے بچہ کی لاش ملی، اسی موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔(۲)

علامہ ہیثمیؒ کا بیان ہے کہ اس کی سند میں بعض غیر معروف رواۃ ہیں، — پس یہ روایت سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہے اور عقلاً بھی ناقابل قبول؛ کیوں کہ آپ ﷺ کی طبیعت میں بے حد نظافت تھی، پھر کیسے ممکن ہے کہ چار دنوں تک گھر میں جھاڑو نہ دی گئی ہو اور چار دنوں میں تو لاش کی بدبو پھیلنے لگتی ہے، پھر بھی آپ کو کچھ اندازہ نہ ہوا ہو؟

● کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آیت کے نازل ہونے کے سلسلہ میں احادیث میں دو اسباب کا ذکر ہوتا ہے، دونوں کا ذکر صراحتاً کیا جاتا ہے اور دونوں روایتیں معتبر طریقہ پر ثابت ہوتی ہیں، ایسی صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آیت ایک ہی واقعہ کی مناسبت سے دوبار نازل ہوئی ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک موقع پر نازل ہوئی ہو، اسی طرح کے کسی اور موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو پڑھا تو نقل کرنے والے نے خاص اسی واقعہ کو اس کا سببِ نزول خیال کرلیا ہو، جیسے بخاری کی روایت ہے کہ آیت لعان (نور:۶) حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی، (۳) اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت عُوَیمر عجلانی کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔(۴)

---

(۱) بخاری، باب التفسیر سورۃ الضحیٰ، حدیث نمبر: ۴۶۶۷۔ (۲) الطبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر: ۶۳۶۔
(۳) بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۷۴۸۔ (۴) بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۳۳۶۔

ایک اہم اُصول

البتہ اُصولی طور پر یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ اگر کوئی آیت کسی خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہو تو اس کا حکم اسی واقعہ تک محدود نہیں رہے گا؛ بلکہ اس طرح کے جو بھی واقعات پیش آئیں، سب پر یہی حکم جاری ہوگا، جیسے آیت لعان کا حکم ایسے تمام واقعات کے لئے عام ہے، مذکورہ واقعات تک محدود نہیں، یا اِفک (تہمت اندازی) کا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سلسلہ میں پیش آیا؛ لیکن یہ حکم ان تمام لوگوں کے لئے عام ہے، جو کسی پاکدامن مسلمان پر تہمت لگائیں، اس سلسلہ میں اہل علم کے یہاں قاعدہ معروف ہے:

العبرة لعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔ (۱)

لفظ کے عام ہونے کا اعتبار ہے نہ کہ سبب کے خاص ہونے کا۔

نسخ

پہلے جو احکام دیئے گئے تھے، ان کے ختم کردینے کو "نسخ" کہتے ہیں۔

یہ بات تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ایک حکم دیا جائے، جو ہمیشہ کے لئے ہو، پھر تجربہ سے وہ درست ثابت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا حکم دیں؛ کیوں کہ یہ تو علم و واقفیت میں نقص اور کمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم نقص سے ماوراء ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ 'نسخ' بندہ کے علم کے اعتبار سے حکم میں تبدیلی ہے، اللہ تعالیٰ کے علم کے اعتبار سے کوئی تبدیلی نہیں؛ بلکہ اللہ کی طرف سے پہلے سے اس حکم کی جو مدت مقرر تھی، نسخ کا حکم اسی کی اطلاع ہے؛ اسی لئے بعض علماء نے نسخ کی تعریف کی ہے کہ یہ حکم شرعی کی انتہاءِ مدت کو بیان کرنے کا نام ہے: "**هو بيان انتهاء الحكم الشرعي**" (۲) جیسے ایک دانا طبیب مریض کو بہ یک وقت مختلف مراحل میں آنے والی دواؤں سے آگاہ نہیں کرتا؛ بلکہ ایک نسخہ لکھتا ہے، پھر چند دنوں بعد اس کی جگہ دوسری دوا تجویز کرتا ہے، یہ طبیب کے علم میں پہلے سے ہے،

---

(۱) الدر المختار: ۳/۱۴۳۔ (۲) کشف الاسرار: ۳/۳۰۰۔

مگر مریض خیال کرتا ہے کہ معالج نے دوا میں تبدیلی کردی ہے، مثلاً: شراب کے حرام ہونے کا حکم تین مرحلوں میں دیا گیا، پہلے مرحلہ میں فرمایا گیا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ ہے، (البقرۃ:۲۱۹) دوسرے مرحلہ میں ارشاد ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ ہو، (النساء: ۴۳) تیسرے مرحلہ میں شراب مکمل طور پر حرام کردی گئی، (المائدۃ: ۹۰) —— حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اگر پہلے ہی مرحلہ میں شراب مکمل طور پر حرام کردی جاتی تو شاید عربوں کے لئے اس سے بچنا دشوار ہوتا۔(۱)

قرآن مجید نے پہلی آسمانی کتابوں کو منسوخ کردیا ہے، اسی طرح خود قرآن مجید میں بھی بعض احکام کا نسخ ہوا ہے، قرآن میں اس کا ذکر موجود ہے، (البقرۃ:۱۰۶، النحل:۱۰۱) لیکن منسوخ احکام کی تعداد کیا ہے؟ —— اس سلسلہ میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، متقدمین تقریباً پانچ سو آیات کو منسوخ قرار دیتے تھے، اگر ایک حکم ایک جگہ مطلق ذکر کیا گیا اور دوسری جگہ قید کے ساتھ، یا ایک جگہ حکم ''عام'' رکھا گیا اور دوسری جگہ خاص، تو وہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کی وضاحت قرار دینے کی بجائے ''نسخ'' کہتے تھے، یہ تعبیر مجازاً تھی؛ ورنہ منسوخ تو وہ احکام ہیں، جو بالکل ہی ختم کردیئے گئے ہوں۔

نسخ کے اس حقیقی معنی کے لحاظ سے علامہ ابن عربی نے ۲۱ آیات کو منسوخ مانا ہے، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ ان میں سے دو آیات (نساء:۸، نور:۵۸) کا حکم اب بھی باقی ہے اور ان پر عمل مکمل طور پر ختم نہیں کیا گیا ہے، اس طرح علامہ سیوطی کے نزدیک ۱۹ آیتیں منسوخ ہیں، شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان ۱۹ میں سے پانچ کو منسوخ قرار دیا ہے اور باقی پر فی الجملہ عمل باقی ہے، یہ پانچ آیتیں یہ ہیں :

(۱) سورۂ بقرہ (آیت:۱۸۰) —— یہ آیت میراث (نساء:۱۱-۱۴) سے منسوخ ہے۔

(۲) سورۂ بقرہ (آیت:۲۴۰) —— جس میں عدت کی مدت ایک سال ذکر کی گئی ہے —— اس کی ناسخ بقرہ:۲۳۴ ہے، جس میں عدت وفات چار ماہ دس دن کردی گئی ہے۔

(۱) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر: ۴۷۰۷۔

(۳) سورۂ انفال (آیت: ۶۵) جس میں بیس مسلمان مجاہدین کو دو سو کافر فوجیوں کے مقابلہ لازمی طور پر جمے رہنے کا حکم دیا گیا ہے — اس کو انفال: ۶۶ نے منسوخ کردیا ہے، جس میں سو مجاہدین کو دو سو غیر مسلم فوجیوں کے مقابلہ جمے رہنے کا حکم ہے۔

(۴) سورۂ احزاب (آیت: ۵۲) — رسول اللہ ﷺ کو ابتداء بلا تحدید تعدد نکاح کی خصوصی اجازت دی گئی تھی، بعد کو اس آیت کے ذریعہ مزید نکاح سے منع فرمادیا گیا۔

(۵) سورۂ مجادلہ (آیت: ۱۲) — اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سرگوشی کا شرف حاصل کرنے کے لئے پہلے صدقہ کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا — بعد میں اس لزوم کو ختم کردیا گیا۔ (مجادلہ: ۱۳)

تمرینی سوالات

(۱) فہم قرآن مجید کے لئے اسبابِ نزول کو جاننے کی کیا اہمیت ہے؟ مثالوں سے واضح کیجئے۔

(۲) کسی واقعہ کے سببِ نزول ہونے کے سلسلہ میں کس طرح واقف ہوا جا سکتا ہے؟

(۳) اگر ایک ہی آیت کے سلسلہ میں دو اسبابِ نزول ذکر کئے جائیں تو ترجیح و تطبیق کا کیا طریقہ ہوگا؟

(۴) آیت قرآن کا حکم واقعہ نزول تک محدود ہوگا یا عام؟ واضح کیجئے اور مثال دیجئے۔

(۵) نص کی حقیقت کیا ہے؟

(۶) علامہ ابن عربی اور علامہ سیوطیؒ نے کتنی آیات کو منسوخ مانا ہے؟

(۷) شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے کن کن آیتوں کو منسوخ مانا ہے اور کن آیات کو ان کا ناسخ قرار دیا ہے؟

مضامین قرآن مجید

قرآن مجید میں جو مضامین آئے ہیں، بنیادی طور پر وہ چھ ہیں :

(۱) احکام۔ (۲) جدل۔
(۳) تذکیر بآلاء اللہ۔ (۴) تذکیر بایام اللہ۔
(۵) تذکیر بالموت۔ (۶) امثال۔

جدل

''جدل'' سے مراد کسی فکر کی مدلل تردید کرنا ہے، قرآن مجید میں اس کے زمانۂ نزول کے پس منظر میں خاص طور پر پانچ گروہوں پر رد کیا گیا ہے :

۱- مشرکین

مشرکین پر رد کرتے ہوئے ان کی اصل بیماریوں کو خاص طور پر ہدف بنایا گیا ہے، شرک کا عمومی سبب دو باتیں تھیں، تشبیہ اور آباء واجداد کی اندھی تقلید — تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ وہ صفات و اختیارات میں بعض مخلوقات کو خدا کے مشابہ قرار دیتے تھے اور خدا کی طاقت میں شریک مانتے تھے؛ اس لئے وہ ان کو معبود کے درجہ میں رکھتے تھے، قرآن مجید نے بار بار اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات اور قدرت میں یکتا ہیں، کوئی ان کا ہمسر اور مشابہ نہیں ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے کہ کائنات کا پورا نظام اللہ تعالیٰ براہ راست چلا رہے ہیں اور اس میں کسی مخلوق کے محتاج نہیں ہیں، جیسا کہ انسان مملکت کے نظام کو چلانے میں مددگاروں کا محتاج ہوتا ہے۔

مشرکین مکہ شرک کے حق ہونے پر ایک دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ ان کے آباء واجداد سے یہی ہوتا آیا ہے اور پھر اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی کیا کرتے تھے، قرآن کریم میں ان کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اولاً تو حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید خالص پر قائم تھے، دوسرے اگر آباء واجداد خود ناواقف ہوں تو ان کی تقلید کرنا عقل کی رو سے بھی غلط ہے؛ کیوں کہ ناواقف کی تقلید انسان کو گمراہی کی طرف ہی لے جاتی ہے۔

اگرچہ مشرکین مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کرتے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تھے، اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا

اعتراض یہ تھا کہ آپ ﷺ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور انسانی ضرورتوں سے دوچار ہیں، پھر آپ کیسے اللہ کے پیغمبر ہو سکتے ہیں؟ —— قرآن نے اس کی تردید کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ جو پیغمبر پہلے گذر چکے ہیں، وہ بھی انسان ہی تھے، انسانوں کے درمیان کسی انسان ہی کو نبی بنانا مصلحت کا تقاضہ ہے؛ تاکہ وہ اپنے متبعین کے لئے نمونہ بن سکیں؛ کیوں کہ کوئی فرشتہ یا جنات انسان کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، پھر یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کے مالک ہیں تو اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنی رسالت کے لئے منتخب فرمائیں۔

مشرکین مکہ کو "بعث بعد الموت" سے بھی انکار تھا، قرآن مجید نے اس پر رد کیا ہے اور اس کو عقل اور فطرت کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ جیسے زمین مردہ ہو جاتی ہے اور پھر اللہ بارش کے ذریعہ اس کو زندہ کرتے ہیں، اسی طرح اللہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کریں گے۔

۲- یہود

یہود اگرچہ توحید پر ایمان رکھتے تھے اور تورات کو مانتے تھے؛ لیکن اس کے باوجود وہ مختلف برائیوں میں مبتلا تھے، ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر صرف اس لئے ایمان نہیں لاتے تھے کہ آپ ﷺ بنواسماعیل میں سے ہیں نہ کہ بنواسحاق میں سے، اس کے علاوہ وہ تورات کے احکام میں لفظی اور معنوی تحریف کے بھی مرتکب تھے، وہ تورات کے بعض احکام غریبوں اور کمزوروں پر نافذ کرتے تھے اور دولت مندوں اور طاقتوروں کو چھوڑ دیتے تھے —— قرآن مجید نے یہ اور اس طرح کی دوسری اخلاقی برائیوں پر تنقید کی ہے اور خود حضرت ابراہیم ؈ اور انبیاء بنی اسرائیل کے قصص و واقعات کے حوالہ سے ان پر رد کیا ہے۔

۳- نصاریٰ

عیسائیوں کے تین بنیادی عقائد ہیں، ان پر قرآن مجید نے تنقید کی ہے :

اول : عقیدۂ تثلیث یعنی عیسائیوں کے نزدیک تین خدا ہیں، باپ یعنی خالق کائنات، بیٹا یعنی حضرت عیسیٰ ؈، اور روح القدس، یہ تینوں مل کر ایک بنتے ہیں۔

دوسرے : حضرت عیسیٰ ؑ کو صلیب پر چڑھائے جانے کا عقیدہ، یعنی ان کے خیال کے مطابق حضرت آدم ؑ نے جنت میں گناہ کیا تھا، ان کا گناہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اس کے کفارہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ اپنے بیٹے کو پیدا کیا، جو سولی پر چڑھائے گئے اور وہ پوری نسل انسانی کے گناہوں کے لئے کفارہ بن گئے۔

تیسرے : حضرت عیسیٰ ؑ نے رسول اللہ ﷺ کی بشارت دی تھی، یہ بشارت ''احمد'' کے نام سے تھی، عبرانی زبان میں 'احمد' کا ترجمہ اس کے ہم معنی لفظ ''فارقلیط'' سے کردیا گیا؛ حالاں کہ ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جاتا، پھر معنوی تحریف بھی کی کہ ''فارقلیط'' کا ترجمہ قابل تعریف کے بجائے 'مددگار' کرنے لگے۔

قرآن مجید نے موقع بہ موقع عیسائیوں کی ان تینوں گمراہیوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور انسانی عقل وفطرت کی دلیلوں سے رد کیا ہے۔

۴- منافقین

منافقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے آپ کو بظاہر مسلمان کہتے تھے اور کلمہ طیبہ پڑھتے تھے؛ لیکن اپنے دل میں کفر کو چھپائے رہتے تھے، ان کا اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا یا تو مسلمانوں کے خوف سے ہوتا تھا یا کچھ مادی فائدے جیسے مالِ غنیمت اور مالِ زکوۃ حاصل کرنے کے لئے۔

بظاہر یہ چاروں طبقے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھے؛ لیکن درحقیقت قرآن مجید میں اُن تمام طبقوں کا ذکر موجود ہے، جو قیامت تک باقی رہنے والی آسمانی کتاب ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مختلف گروہ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

تذکیر بالآء اللہ

اس سے مراد اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید نے جابجا آسمان وزمین کی تخلیق، بارش و پانی کے نظام، پھلوں اور کھیتیوں

کی پیداوار وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے نعمت عطا فرمانے والے خدا کی بندگی کی دعوت دی ہے۔

تذکیر بایام اللہ

ایام اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک فرمایا اور اپنی نافرمانی کرنے والوں کو کیا سزائیں دیں؟ — قرآن مجید نے اس کے لئے مختلف انبیاء اور ان کے احوال وواقعات کو بیان کیا ہے، جن کو "قصص" کہا جاتا ہے، قرآن نے بعض قصص کو مخاطب کی ضرورت اور واقعات کی مناسبت سے بار بار ذکر فرمایا ہے، جیسے: حضرت آدم ﷺ کی تخلیق، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ علیہم السلام اور فرعون وغیرہ کے واقعات، اور بعض کا ایک دو جگہ ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، جیسے: حضرت یوسف ﷺ کا واقعہ، یا حضرت موسیٰ ﷺ اور حضرت خضر کی ملاقات، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے قصے۔

تذکیر بالموت

انسان کو سب سے زیادہ خوف دلانے والا اور صحیح راستہ پر قائم رکھنے والا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان کو مرنا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اس لئے قرآن مجید میں اس مضمون کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جنت کے انعامات اور دوزخ کی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

احکام

قرآن مجید نے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں؛ چنانچہ اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً پانچ سو آیات وہ ہیں جن میں عملی زندگی کے احکام بیان کئے گئے ہیں، شیخ عبدالوہاب الخلاف نے عبادات کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق آنے والے صریح احکام کے اعداد وشمار اس طرح ذکر کئے ہیں:

امثال

مثالوں سے کسی بات کا سمجھنا آسان ہوتا ہے؛ اسی لئے قرآن نے توحید، رسالت، بعث بعد الموت، ہدایت یافتہ اور گمراہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھایا ہے، ان امثال کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو آسانی کے ساتھ بات سمجھ میں آجائے اور نصیحت حاصل کرنے کا ذریعہ بنے:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (الزمر:۲۷)

اور ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں؛ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

قرآن مجید میں امثال کی تعداد ۱۶۶ ہے۔

رسمِ قرآنی

عربی زبان میں حروف جس طرح بولے جاتے ہیں، عام طور پر اسی طرح لکھے بھی جاتے ہیں؛ جب کہ بعض زبانوں میں حروف کے تلفظ اور کتابت کی شکل الگ الگ ہوتی ہے، جیسے انگریزی میں "C" لکھا جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا تلفظ "K" کی طرح ہوتا ہے،

---

(۱) علم اُصول الفقہ:۳۱-۳۲۔

یا "S" لکھا جاتا ہے اور اس کا تلفظ "Z" کی طرح ہوتا ہے، عربی زبان کی کتابت عام طور پر ایک مقرر اُصول کے مطابق ہوتی ہے؛ لیکن قرآن مجید کی کتابت میں کہیں کہیں الگ منہج اختیار کیا گیا ہے؛ اس لئے عربی زبان کے عام طریقۂ کتابت کو ''رسم قیاسی'' اور قرآن مجید کے طریقۂ کتابت کو حضرت عثمان غنی ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ''رسم عثمانی'' کہا جاتا ہے۔

حضرت عثمان ﷺ کی طرف اس کی نسبت اس لئے کی جاتی ہے کہ آپ نے مصحف قرآنی کے متعدد نسخے تیار کرائے اور مختلف علاقوں میں بھیجے، وہ اسی طریقۂ تحریر کے مطابق تھے —— رسم عثمانی کی کیا حیثیت ہے؟ اس سلسلہ میں اہل علم کے تین اقوال ہیں :

(۱) یہ طریقۂ تحریر توقیفی ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے اسی طریقہ پر وحی کی کتابت کرائی تھی۔

(۲) یہ طریقۂ تحریر ہے تو اجتہادی، جس کو عہد عثمانی کے کاتبین نے اختیار کیا تھا؛ لیکن اسی وقت اس پر صحابہ کا اجماع و اتفاق ہوگیا اور اُمت میں اسے قبول عام و تام حاصل ہو چکا ہے۔

(۳) قرآن مجید کا رسم الخط بھی اجتہادی ہے اور عربی زبان کی دوسری تحریروں کے مطابق اسے لکھنا اور اگر کسی زمانہ میں کوئی تبدیلی ہو تو اسے قبول کرنا جائز ہے۔

ان میں سے تیسرے قول کے مطابق مصحف قرآنی کی کتابت میں رسم عثمانی کی پابندی ضروری نہیں، پہلے اور دوسرے قول کے مطابق رسم عثمانی کی پابندی ضروری ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں، یہی جمہور کا مسلک ہے، امام احمدؒ نے تو اس کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے :

تحرم مخالفة خط مصحف عثمان فی یاء أو واؤ أو ألف أو غیر ذلک۔ (۱)

ی، و، الف وغیرہ میں حضرت عثمان غنی ﷺ کے مصحف کے خط کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

رسم عثمانی پر قائم رہنے کے متعدد فوائد ہیں، جن میں دو نہایت اہم ہیں، ایک: حفاظت قرآن؛ کہ جیسے قرآن مجید کے الفاظ محفوظ ہیں اور عہد نبوی سے نقل ہوتے آئے ہیں، اسی طرح

---

(۱) کشاف القناع: ۱/۱۳۶۔

اس ''خط'' کی صورت میں قرآن مجید کا وہ طریقہ کتابت بھی منقول ہے، جو عہد نبوی اور عہد صحابہ میں اختیار کیا گیا، دوسرے: مصحف عثمانی میں کتابت کا ایسا منہج اختیار کیا گیا کہ اس میں مختلف قراءتیں اور مختلف قبائل کے لہجے جمع ہو جاتے ہیں، گویا رسم عثمانی تمام قراءتوں اور لہجوں کو سموئے ہوا ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) قرآن مجید میں کتنی طرح کے مضامین آئے ہیں؟ کسی قدر وضاحت کے ساتھ اس پر نوٹ لکھئے۔

(۲) کس شعبۂ زندگی سے متعلق قرآن مجید میں کتنی آیات احکام شمار کی گئی ہیں؟

(۳) قرآن مجید میں امثال کی کل کتنی تعداد ہے؟

(۴) رسم قیاسی اور رسم عثمانی سے کیا مراد ہے؟

(۵) رسم عثمانی کی کیا حیثیت ہے اور اس طریقہ تحریر پر قائم رہنے کے کیا فوائد ہیں؟

جمع قرآن

قرآن مجید موجودہ ترتیب کے مطابق نازل نہیں ہوا، اس کی موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق حضرت محمد ﷺ کے زیر نگرانی صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پائی، عہد نبوی ﷺ میں اس کی حفاظت دو پہلوؤں سے کی گئی :

(۱) حفظ کے ذریعہ۔

(۲) کتابت کے ذریعہ۔

۱۔ بصورت حفظ

عہد نبوی ﷺ میں جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا، اہل عرب پڑھنا لکھنا بہت کم جانتے تھے، اس وقت پڑھنے لکھنے کے وسائل یعنی کاغذ وغیرہ بھی آسانی سے میسر نہیں تھے اور لوگ

کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے اسے یاد کر لیتے تھے، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، یوں بھی اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، وہ طویل قصائد، مشہور جنگوں کے واقعات، نسب نامے حتیٰ کہ اپنے جانوروں تک کے پشتہا پشت کے نسب نامے زبانی یاد رکھتے تھے؛ چنانچہ قرآن نازل ہوا تو انھوں نے پورے ذوق وشوق سے اسے یاد کرنا شروع کر دیا، صحابۂ کرام کو قرآن سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، اسی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ عہد نبوی ﷺ میں ہی حفاظ صحابہ کی ایک بڑی تعداد وجود میں آ گئی تھی، روایات میں تقریباً چالیس صحابہ ﷺ کا ذکر ملتا ہے، جنھوں نے پورا قرآن یاد کر لیا تھا، ان میں سے چند اہم نام یہ ہیں:

خلفاء اربعہ، حضرت طلحہ، حضرت سعد، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبد اللہ ابن عمر، حضرت عبد اللہ ابن عباس، حضرت عمرو بن العاص اور ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ، حضرت عبد اللہ ابن زبیر، حضرت عبد اللہ ابن سائب، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابودرداء، حضرت مُجمع بن حارثہ، حضرت انس بن مالک اور ان کے چچا ابوزید، اُمہات المومنین: حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت اُم سلمہ ﷺ۔(۱)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں کل صحابہ جنھیں پورا قرآن یاد تھا، چالیس ہی تھے، یہ تو وہ اصحاب ہیں جن کا نام روایات میں محفوظ رہ گیا ہے، ورنہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزوۂ بئر معونہ جو آنحضور ﷺ کی زندگی میں پیش آیا، صرف

(۱) مناہل العرفان: ۱/۲۴۷۔

اس غزوہ میں ستر حفاظ صحابہ ﷡ کے شہید ہونے کا ذکر ملتا ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد ہونے والی جنگ یمامہ میں بھی اتنے ہی حفاظ شہید ہوگئے تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں صحابہ ﷡ کی ایک بڑی تعداد نے پورا قرآن حفظ کرلیا تھا، پھر ایسے صحابہ کا تو کوئی شمار نہیں جنھوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کرر کھے تھے؛ کیوں کہ نماز میں قراءت فرض ہونے کی وجہ سے کسی مسلمان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے قرآن سرے سے یاد ہی نہ ہو، پھر حفاظ کی یہ تعداد عہد بہ عہد بڑھتی ہی رہی اور اس طرح ایک بڑی تعداد کے ذریعہ سینہ بہ سینہ قرآن مجید منتقل ہوتا رہا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

۲- بصورتِ کتابت

قرآن کی حفاظت کا خصوصی اور نہایت اعلیٰ انتظام ہوا کہ اسے حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعہ بھی محفوظ کیا گیا، نبی ﷺ قرآن کی کتابت کا خاص اہتمام فرماتے تھے، جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی، سب سے پہلے اسے لکھواتے، پھر پڑھوا کر سنتے اور اس کی اصلاح فرماتے؛ تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے اور تب جاکر اس کی عام اشاعت کا حکم دیا کرتے تھے۔

آپ ﷺ نہ صرف آیات کو لکھوایا کرتے؛ بلکہ سورتوں کے اندر آیات کا مقام اور سورتوں کی ترتیب کی بھی نشاندہی فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس ﷠ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ ﷺ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیت کے بعد لکھا جائے، (۱) عرب میں اس زمانہ میں کاغذ کمیاب تھا؛ اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں اور جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی میسر آنے پر کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے جاتے تھے اور پھر یہ کتابت شدہ صفحات رسول اللہ ﷺ کے دولت خانہ میں محفوظ کردیئے جاتے۔ (۲)

---

(۱) ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب سورۃ توبۃ، حدیث نمبر:۳۰۸۶۔

(۲) مناہل العرفان:۱/۱۷۸۔

اس کام کے لئے آپ ﷺ نے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مقرر فرمایا تھا، ان کاتبینِ وحی کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے، یعنی چالیس صحابہ تھے، جو نبی کریم ﷺ کے لئے کتابتِ وحی کا فریضہ انجام دیتے تھے، ان میں سے چند مشہور صحابہ کے نام ہیں :

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ۔

اس طرح عہدِ نبوی ﷺ ہی میں قرآن مجید پورا کا پورا لکھا ہوا موجود تھا اور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کی ترتیب متعین فرمادی تھی، بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس بھی قرآن کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے، گرچہ وہ مختلف ٹکڑوں، ہڈیوں اور پارچوں پر لکھے ہوئے تھے، خود حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھ کر قرآن کو کاغذ کے مختلف ٹکڑوں سے اکٹھا کیا کرتے تھے: **"کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع"**(۱) اس کا اندازہ ان روایات سے بھی ہوتا ہے جن میں نبی کریم ﷺ نے قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کی فضیلت بیان کی ہے اور دشمن کے علاقہ میں قرآن کے نسخے لے جانے سے منع فرمایا ہے؛ تاکہ دشمن اس کی بے حرمتی نہ کریں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مکمل طور سے لکھا ہوا تھا اور مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس بھی اس کے نسخے موجود تھے۔

عہدِ صدیقی میں

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک واقعہ پیش آیا کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدشہ محسوس کیا کہ کہیں اس طرح کی

(۱) ترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل الشام والیمن، حدیث نمبر: ۳۹۵۴۔

مزید جنگوں میں حفاظ کی بڑی تعداد شہید نہ ہوجائے؛ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ اُمت کی اجتماعی تصدیق سے ایک نسخہ تیار کرائیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ابتداءً ایک ایسے کام کو انجام دینے میں تامل ہوا، جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بار بار توجہ دلانے پر ان کو بھی اطمینان ہوگیا، اب اس اہم کام کے لئے کسی غیر معمولی صلاحیت کے حامل فرد کی ضرورت تھی؛ چنانچہ ان کی نظر انتخاب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر پڑی؛ کیوں کہ وہ نوجوان، سمجھدار، بااعتماد شخص تھے، حافظ قرآن بھی تھے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کا فریضہ بھی انجام دے چکے تھے، یہ کام اس قدر ذمہ داری کا متقاضی اور اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا، جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا'' **فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال الخ''**۔(۱)

اس مرحلہ میں جمع قرآن کی اہمیت اور اس سلسلے میں کئے جانے والے غیر معمولی اہتمام کا اندازہ اس طریق کار سے لگایا جاسکتا ہے، جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر اختیار کیا، انھوں نے قرآن کا یہ نسخہ محض اپنے حفظ یا دیگر حفاظ صحابہ کی یادداشت کی بنیاد پر تیار نہیں کیا؛ بلکہ اس کے لئے ایک نہایت مشکل اور پیچیدہ؛ لیکن انتہائی باوثوق اور محفوظ طریقہ کا انتخاب کیا، ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اس وقت تک اپنے نسخے میں کوئی آیت درج نہیں کرتے تھے، جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی دونوں شہادتیں نہ مل جاتیں، پھر وہ لکھی ہوئی آیات تب ہی قبول فرماتے تھے، جب اس تحریر کے سلسلے میں دو لوگ گواہی دے دیتے کہ یہ آیات آنحضور ﷺ کی نگرانی میں لکھی گئی تھیں، پھر ان طریقوں سے اکٹھا کی ہوئی آیات کا مقابلہ ان مجموعوں سے کیا جاتا تھا، جو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم نے تیار کر رکھے تھے؛ چنانچہ تحقیق کے ان اعلیٰ اُصولوں کے تحت اُمت کی اجتماعی تصدیق سے قرآن مجید کا ایک نسخہ وجود میں آیا، اگر ہم اس نسخے کی تیاری کے سلسلہ میں برتی جانے والی غیر معمولی احتیاط اور محفوظ طریق کار

(۱) بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث نمبر: ۴۹۸۶۔

کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مقصد صرف قرآنی آیات کو ایک جگہ اکٹھا کرنا نہیں تھا، کیوں کہ اس طرح کے تو بہت سے نسخے صحابہ کرام ﷺ کے پاس موجود تھے؛ بلکہ اس کا مقصد ایک ایسا نسخہ تیار کرنا تھا، جو اُمت کی اجتماعی تصدیق کے ذریعہ تیار شدہ ہو اور جس کی موجودگی میں آگے چل کر کسی فتنہ و اختلاف کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

جمع عہد صدیقی کی خصوصیات

عہد صدیقی میں مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق قرآن کا جو نسخہ تیار ہوا، وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل تھا :

- قرآن کا یہ نسخہ نہایت اعلیٰ تحقیقی اُصولوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا اور اس میں اُمت کی اجماعی تصدیق شامل تھی۔
- اس نسخہ میں تمام آیات آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی تھیں؛ البتہ ہر سورہ علاحدہ علاحدہ لکھی گئی تھی۔
- یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔
- اس میں صرف وہی آیتیں شامل تھیں، جو حضرت جبرئیل ﷺ نے آپ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری رمضان المبارک میں آپ کو پورا قرآن سناتے وقت پڑھی تھیں اور اسی ترتیب کے مطابق تھیں، اگر کوئی منسوخ التلاوۃ آیت رہی ہو تو وہ اس میں شامل نہیں تھی۔

آپ کی حیات میں یہ نسخہ آپ کے پاس رہا، پھر حضرت عمر ﷺ کے پاس رہا، حضرت عمر ﷺ کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت حفصہ ؓ کے حوالہ ہو گیا اور حضرت حفصہ ؓ کے انتقال کے بعد مروان نے اپنے عہد حکومت میں اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب حضرت عثمان ﷺ کے دور میں جمع کردہ مصاحف کے رسم الخط پر اُمت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا؛ چنانچہ مناسب نہ تھا کہ کوئی ایسا نسخہ باقی رہے، جو رسم الخط میں عثمانی مصاحف سے مختلف ہو۔

عہدعثمانی میں

حضرت عثمان ﷛ کے عہد میں جمع قرآن کی نوعیت جاننے سے قبل ایک بنیادی نکتہ سے واقف ہونا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قرآن کریم مختلف طریقوں سے پڑھا ہے، ان مختلف طریقوں کو قرآن کی قراءتیں کہا جاتا ہے اور قرآن میں ان تمام قراءتوں کی گنجائش ہے، جو نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، نبی کریم ﷺ نے مختلف صحابہ ﷡ کو مختلف قراءتوں کے مطابق قرآن کی تعلیم دی تھی۔

جب حضرت عثمان ﷛ خلیفہ بنے تو اس وقت تک اسلام کی سرحدیں بہت وسیع ہوچکی تھیں اور اسلام دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ ان صحابہ سے قرآن سیکھتے، جو ان کے علاقہ میں موجود تھے، اس طرح مختلف صحابہ سے قرآن سیکھنے کی وجہ سے مختلف علاقوں میں مختلف قراءتیں رائج ہوگئیں، اب جب وہ لوگ کبھی آپس میں ملتے تو اپنی قراءت کو درست اور دوسرے کی قراءت کو غلط سمجھتے، اس طرح ان میں اختلاف پیدا ہوتا اور بعض مرتبہ نوبت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے تک پہنچ جاتی، ظاہر ہے کہ حضرت عثمان ﷛ جیسا دُور اندیش خلیفہ اس اہم معاملہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا، انھیں متعدد ذرائع سے اس طرح کے واقعات کی اطلاع مل چکی تھی اور خود مدینہ میں بھی اس قسم کے بعض واقعات پیش آئے تھے؛ چنانچہ انھوں نے جلیل القدر صحابہ کرام ﷡ سے مشورہ کیا اور بالآخر وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام اُمت کو ایک مصحف پر جمع کردیا جائے؛ تاکہ پھر کوئی اختلاف وافتراق پیش نہ آئے۔

جمع عہدعثمانی کی خصوصیات

حضرت عثمان ﷛ نے اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جو حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام ﷡ پر مشتمل تھی، بعد میں چند اور صحابہ ﷡ کو بھی اس میں شامل کیا گیا، یہاں تک کہ ان کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، اس کمیٹی نے اس کام کے لئے درج ذیل طریقۂ کار اختیار کیا:

(۱) اس مصحف کی تیاری کے لئے انھوں نے بنیادی طور پر حضرت ابوبکر ﷜ کے زمانہ میں تیار کردہ صحیفہ کو سامنے رکھا ، یہ صحیفہ اس وقت حضرت حفصہ ؓ کی تحویل میں تھا اور حضرت عثمان ﷜ نے اس کام کے لئے ان سے حاصل کیا تھا۔

(۲) حضرت ابوبکر ﷜ کے زمانہ میں جو صحیفہ تیار ہوا تھا، اس میں سورتیں مرتب شکل میں نہ تھیں ، بلکہ ہر سورت الگ الگ جزء میں لکھی ہوئی تھی ، ان حضرات نے ایک نسخہ میں آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق سورتوں کو مرتب شکل میں تحریر کیا۔

(۳) اس مرحلہ کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ ان حضرات نے قرآن کریم کو لکھنے کے لئے ایسا رسم الخط منتخب کیا، جس میں قرآن کی تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی غرض سے نہ تو ان پر نقطے لگائے گئے اور نہ ہی اعراب ؛ تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، یہی وہ اصل کام تھا، جس کے لئے عہد عثمانی ﷜ میں جمع قرآن کی ضرورت پیش آئی تھی ۔

(۴) اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی قراءت میں اختلاف ہوتا تو اس کو قریش کی لغت کے مطابق لکھا جاتا ؛ کیوں کہ قرآن مجید اصل میں قریش ہی کی لغت میں نازل کیا گیا تھا۔

اس طریق کار کے مطابق قرآن کریم کا جو نسخہ تیار ہوا ، اس کی موجودگی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی ؛ کیوں کہ اس نسخہ میں تمام قراءتیں شامل تھیں اور ہر شخص اپنی قراءت کے مطابق ان سے تلاوت کرسکتا تھا۔

اس کمیٹی نے اس نئے مرتب کردہ مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت عثمان ﷜ نے کل پانچ مصحف تیار کرائے تھے ؛ لیکن معروف عالم ابوحاتم سجستانی ؒ کی رائے ہے کہ سات مصاحف تیار کرائے گئے تھے، ان میں سے ایک مصحف مکہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا اور ایک مدینہ میں محفوظ رکھا گیا، اس طرح پوری اسلامی سلطنت میں ایک ہی نسخہ کو رائج کردیا گیا۔

قرآن کریم کے یہ معیاری نسخے تیار کرانے اور انھیں پوری اسلامی مملکت میں پھیلا دینے کے بعد حضرت عثمان ﷜ نے وہ تمام ذاتی نسخے جلادینے کا حکم دیا، جو مختلف صحابہ کے پاس موجود تھے ؛ تاکہ مصحف تیار کرانے کا ان کا مقصد حاصل ہوسکے اور ساری اُمت ایک ہی

مصحف پر جمع ہوجائے اور پھر کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہے؛ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک قرآن مجید کی کتابت کے لئے وہی خط رائج ہے، جو حضرت عثمان ﷛ نے اختیار کیا، اسی لئے اسے ''رسمِ عثمانی'' کہا جاتا ہے اور مصاحف کو اسی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے۔

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب

اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ قرآن مجید کے کلمات کی ترتیب توقیفی ہے اور آیات بھی توقیفی ہیں، اس میں اجتہاد کو دخل نہیں؛ بلکہ جس ترتیب سے حضرت جبرئیل ﷤ نے حضور ﷺ پر نازل کیا، اسی ترتیب سے آپ نے اس کی کتابت کرائی اور اسی طرح مصحف صدیقی اور مصحف عثمانی میں اسے تحریر کیا گیا؛ اسی طرح قرآن مجید کی سورتیں بھی توقیفی ہیں، یعنی اس میں اجتہاد کو دخل نہیں، جیسا کہ حضرت عثمان غنی ﷛ سے روایت ہے کہ جب آپ ﷺ پر کوئی آیت نازل ہوئی تو آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو طلب فرماتے اور فرماتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں لکھو جس میں یہ اور یہ بات ذکر کی گئی ہے(۱) جمہور کی رائے یہ ہے کہ سورتوں کے جو نام ہیں وہ بھی توقیفی ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ نے سورتوں کو ان ناموں سے موسوم فرمایا ہے؛ اسی لئے حدیث میں بہت سی سورتوں کے نام وارد ہوئے ہیں، جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**اقرؤا الزهراوين : البقرة وآل عمران**''۔(۲)

مقدار کے اعتبار سے سورتوں کی قسمیں

آیات کی مقدار کے اعتبار سے قرآن کی سورتوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا:

(۱) طِوال: یہ سورۂ بقرہ سے سورۂ توبہ تک کی سات طویل سورتیں ہیں۔

(۲) مئین: وہ سورتیں جن میں سو یا اس سے کچھ زیادہ یا کچھ کم آیتیں ہیں، یہ انفال سے لے کر غافر تک تیرہ سورتیں ہیں۔

---

(۱) سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر: ۳۰۱۱۔

(۲) مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قراءۃ القرآن وسورۃ البقرۃ، حدیث نمبر: ۱۹۱۰۔

(۳) مَثانی : جن میں سو سے کم اور عموماً مفصلات سے زیادہ آیتیں ہیں، یہ سورۂ رعد سے سورۂ فتح تک اٹھائیس سورتیں ہیں۔

(۴) مُفصلات : جو سورۂ ق سے شروع ہو کر سورۂ ناس پر ختم ہوتی ہیں، پھر ان میں حجرات سے بروج تک ''طِوالِ مفصَّل'' اور بروج سے بینہ تک ''اَوساطِ مفصَّل'' اور اس کے بعد کی سورتیں ''قِصارِ مفصَّل'' کہلاتی ہیں۔

تمرینی سوالات

(۱) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حفاظت قرآن کا فریضہ کن ذرائع کے ذریعہ انجام دیا گیا؟

(۲) عہد صحابہ کے حفاظ اور حافظات میں سے کم سے کم دس کے نام لکھیں؟

(۳) عہد نبوی میں آیات قرآنی کی کتابت کن اشیا پر ہوا کرتی تھیں؟

(۴) کاتبین وحی کی کیا تعداد تھی؟ ان میں خلفاء راشدین کے علاوہ کم سے کم پانچ صحابہ کے نام ذکر کیجئے۔

(۵) عہد صدیقی میں کونسا واقعہ جمع قرآن کا محرک بنا؟

(۶) حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں کن کو جمع قرآن کی خدمت کا ذمہ دار بنایا گیا؟

(۷) عہد صدیقی میں جمع قرآن کی کیا خصوصیات ہیں؟

(۸) عہد عثمانی میں دوبارہ جمع قرآن کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

(۹) عہد عثمانی میں جمع قرآن اور اس کی خصوصیات پر مختصر نوٹ تحریر کیجئے۔

(۱۰) قرآن مجید میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے یا اجتہادی اور اگر توقیفی ہے تو اس کی کیا دلیل ہے؟

(۱۱) آیات کی تعداد کے اعتبار سے قرآنی سورتوں کی کیا تقسیم کی گئی ہے؟

تسہیل تلاوت کی کوششیں

پھر جب اسلامی ریاست کا دائرہ وسیع ہوا اور اسلام ان لوگوں تک پہنچا جو عربی زبان سے ناواقف تھے، تو انھیں قرآن پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک قرآن میں نہ تو نقطے لگائے گئے تھے اور نہ ہی حرکات کی ضرورت محسوس کی گئی تھی، اسی طرح تلاوتِ قرآن مکمل کرنے میں آسانی کے لئے قرآن میں مختلف حصوں کی تقسیم بھی عمل میں نہیں آئی تھی؛ چنانچہ بعد کے ادوار میں جیسے جیسے ضرورت محسوس کی گئی، قراءت قرآن میں آسانی پیدا کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے، جن کے نتیجے میں ہر شخص خواہ وہ عربی زبان سے ناواقف ہی کیوں نہ ہو، اس قابل ہوگیا کہ قرآن کو آسانی سے پڑھ سکے —— تسہیل تلاوت کے یہ اقدامات درج ذیل ہیں :

۱- قرآن مجید پر نقطے

شروع میں اہل عرب میں نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، وہ بغیر نقطوں کے لکھنے اور پڑھنے کے عادی تھے؛ چنانچہ مصاحف عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے، ان مصاحف کے نقطوں سے خالی ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس طرح اس میں تمام متواتر قراءتیں سما سکیں؛ لیکن جب اسلام غیر عربوں تک پہنچا، تو انھیں بغیر نقطوں کے قرآن پڑھنے میں مشکل پیش آنے لگی؛ لہٰذا ان کی آسانی کے لئے قرآن پر نقطے لگائے گئے۔

قرآن پر نقطے لگانے کا یہ کام عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں انجام پایا، عبدالملک بن مروان نے یہ اہم کام حجاج بن یوسف کے سپرد کیا تھا اور حجاج بن یوسف نے اسے نصر بن عاصم لیثی اور یحییٰ بن یَعْمُر عَدْوانی کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر نقطے لگانے کا کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؒ نے انجام دیا اور یہ کہ عبدالملک بن مروان سے پہلے ابن سیرین کے پاس بھی نقطوں والا ایک قرآن موجود تھا، ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ

ابوالاسود دُوَلیؒ نے قرآن پر سب سے پہلے نقطے لگائے؛ لیکن یہ ایک انفرادی عمل تھا اور ان کے ذاتی نسخے تک محدود تھا، پھر اس کے بعد ابن سیرینؒ نے بھی اپنے ذاتی مصحف پر نقطے لگائے، پھر عبدالملک بن مروان کے ذریعہ یہ کام سرکاری سطح پر انجام پایا۔

۲- اعراب

نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر، زبر، پیش) بھی نہیں تھیں؛ کیوں کہ عربوں میں اس کا رواج نہ تھا اور وہ بغیر حرکات کے لکھنے پڑھنے کے عادی تھے؛ لیکن جب غیر عرب لوگ قرآن پڑھنے میں غلطیاں کرنے لگے تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآن پر حرکات لگائی جائیں؛ چنانچہ سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؒ نے حرکات وضع کیں؛ لیکن یہ حرکات اس طرح کی نہ تھیں، جیسی آج کل معروف ہیں؛ بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ، زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ، پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ اور تنوین کے لئے دو نقطے لگائے گئے، بعد میں خلیل بن احمد نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں۔

اس کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے یحییٰ بن یعمرؒ، نصر بن عاصمؒ اور حسن بصریؒ سے قرآن مجید پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقعہ پر نقطوں اور حرکات میں التباس کے خوف سے ان حضرات نے وہ حرکات وضع کیں، جو آج بھی معروف ہیں۔

۳- منزلیں، پارے اور رُکوع

صحابہ کرام ﷺ کا عام معمول تھا کہ وہ ہفتے میں ایک بار قرآن ختم کرلیا کرتے تھے، انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار متعین کررکھی تھی اور قرآن کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا، ان میں سے ہر حصہ کو ''حزب'' یا ''منزل'' کہا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ سات احزاب کسی معنی اور مفہوم کی رعایت کرتے ہوئے نہیں بنائے گئے تھے؛ بلکہ محض اس لئے بنائے گئے تھے کہ ہر حصہ ایک دن میں ختم ہوجائے اور اس طرح سات دنوں میں پورا قرآن ختم ہوسکے، ان احزاب کی

تقسیم اس طرح تھی کہ پہلا حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا سات سورتوں کا، چوتھا نو سورتوں کا، پانچواں گیارہ سورتوں کا، چھٹا تیرہ سورتوں کا اور آخری سورہ ''ق'' سے آخر قرآن تک کا تھا۔

پورے قرآن کو برابر کے تیس حصوں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے، یہ حصے ''اجزاء'' یا ''پارے'' کہلاتے ہیں، یہ تقسیم من جانب اللہ نہیں ہے اور عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، حجاج بن یوسف کے زمانہ (۷۳ھ تا ۹۵ھ) میں یہ تقسیم عمل میں آئی، اس تقسیم میں قرآن کے معانی و مطالب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے؛ بلکہ قرآن کو پڑھنے، حفظ کرنے اور قرآن کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے یہ تقسیم عمل میں لائی گئی ہے، بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کے لئے یہ بات پسند فرمائی تھی کہ وہ مہینے میں ایک بار قرآن ختم کرلیا کریں، غالباً اسی ہدایت کے پیش نظر یہ تقسیم کی گئی؛ تاکہ ہر مسلمان روزانہ ایک جزء پڑھ کر مہینے میں ایک قرآن ختم کرنے کا شرف حاصل کر سکے۔

جس طرح پورے قرآن مجید کو تیس مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اسی طرح ہر حصے کو مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یہ حصے ''رکوع'' کہلاتے ہیں، یہ تقسیم معنی کے اعتبار سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام مکمل ہوا، وہاں رکوع مکمل ہوگیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ عربی زبان سے ناواقف لوگ از خود یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کس جگہ تلاوت کا سلسلہ ختم کردینا مناسب ہوگا؛ چنانچہ ان کی سہولت کے لئے یہ تقسیم عمل میں لائی گئی، تعیین رکوع کے سلسلہ میں آیتوں کی ایک مناسب تعداد کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اس طرح ایک پارہ عموماً پندرہ سے بیس رُکوعوں میں منقسم ہے، اس کا مقصد آیات کی ایک ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے، جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے اور اس کو رکوع اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر ''رُکوع'' کیا جائے۔

۴- رموز اوقاف

قرآن مجید کی تلاوت میں سہولت کے لئے ایک اہم اور مفید کام یہ کیا گیا کہ آیات کے درمیان ایسی علامتیں مقرر کردی گئیں، جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ اس جگہ رکنا یا ٹھہرنا کیسا ہے؟

ان علامتوں کو ''رموزِ اوقاف'' کہتے ہیں، ان کی مدد سے ایک عربی سے ناواقف انسان بھی درست طریقہ سے تلاوت کرسکتا ہے اور صحیح جگہ پر ٹھہر سکتا ہے، ان علامات کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ غلط جگہ پر وقف کرنے سے معنی میں بسا اوقات غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے، معنی کی اسی تبدیلی سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ علامات وضع کی گئی ہیں، ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابوعبداللہ محمد بن طَیفُور سجاوندیؒ نے وضع کی ہیں، ان میں سے کچھ اہم رموز درج ذیل ہیں :

ط : اس کا مطلب ہے کہ یہاں بات پوری ہوگئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج : اس کا مطلب ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز : اس کا مطلب ہے کہ یہاں وقف کرنا تو درست ہے؛ لیکن بہتر ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

م : یہ وقفِ لازم کا مخفف ہے، یعنی یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے؛ لہٰذا یہاں وقف کرنا ضروری ہے۔

لا : اس کا مطلب ہے کہ یہاں نہ ٹھہرا جائے اور اگر اس مقام پر وقف کیا جائے تو بہتر ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے۔

قف : اس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ، یہ اس جگہ لایا جاتا ہے، جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہوسکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

قرآن مجید پریس میں

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، ہر دور میں ایک جماعت نے کتابتِ قرآن کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا، پھر جب پریس ایجاد ہوا، تو سب سے پہلے ۱۱۱۳ھ میں ہیمبرگ کے مقام پر قرآن کریم طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے؛ لیکن یہ نسخے اسلامی دنیا میں مقبول نہ ہوسکے، مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۸۸۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا،

اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر چھاپا گیا اور پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔

کچھ اہم اعداد و شمار

- قرآن مجید کی کل سورتیں: ۱۱۴۔
- مکی دور میں نازل ہونے والی سورتیں: ۸۶۔
- مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتیں: ۲۸۔
- قرآن مجید کی کل آیات: ۶۳۲۴۔
- قرآن مجید کے کل کلمات: ۷۷۹۳۲۔
- قرآن مجید کے کل حروف: ۳۳۲۰۱۵۔
- قرآن مجید کے کل اجزاء (پارے): ۳۰۔
- قرآن مجید کے کل احزاب: ۷۔
- قرآن مجید میں سجدوں کی تعداد: ۱۵۔

(جن میں سے ایک کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہاں سجدہ کیا جائے گا یا نہیں؟)

- قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ: سورہ بقرہ۔
- قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت: بقرہ: ۲۸۲ (آیت مداینت)۔
- قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ: سورہ کوثر۔
- قرآن مجید کتنے سال کی مدت میں نازل ہوا؟: تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ چودہ دن۔
- پہلی وحی: سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات۔
- آخری وحی: سورہ توبہ کی آخری دو آیات۔
- عہد نبوی ﷺ میں قرآن مجید کے ان حفاظ کی تعداد، جن کے ناموں کی صراحت ملتی ہے: ۴۱۔
- کاتبین وحی کی تعداد: ۴۰۔

مکی و مدنی سورتیں

قرآن کریم کی بعض سورتیں مکی ہیں اور بعض مدنی، یہ تقسیم زمانۂ نزول کے اعتبار سے ہے، مدینہ ہجرت کرنے سے پہلے جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ مکی ہیں، خواہ وہ کسی بھی جگہ نازل ہوئی ہوں، اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے کے بعد جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ مدنی ہیں، خواہ کسی مقام پر نازل ہوئی ہوں، آیات اور سورتوں کے درمیان مکی اور مدنی کی یہ تقسیم اگر چہ نبی کریم ﷺ سے مروی نہیں ہے؛ لیکن بعد میں صحابہ اور تابعین نے آیات اور سورتوں کے بارے میں وضاحت کی کہ فلاں سورہ یا آیت مکی ہے اور فلاں مدنی، اس کے علاوہ بعض دیگر شواہد کی بنیاد پر بھی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کوئی سورہ یا آیت مکی ہے یا مدنی؟

مکی اور مدنی سورتیں چوں کہ مختلف حالات اور ماحول میں نازل ہوئیں اور ان کے مخاطب بھی مختلف تھے؛ اسی لئے ان کے انداز اور اُسلوب میں فرق پایا جاتا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چوں کہ زیادہ تر عرب کے بُت پرستوں سے تھا اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی؛ اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بُت پرستوں کی مدلل تردید، مظاہر فطرت پر غور و فکر کی دعوت اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا۔

مکی سورتوں کی خصوصیات

مکی سورتوں کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) مکی سورتوں میں عام طور سے مشرکین اور بُت پرستوں کو خطاب کیا گیا ہے اور اہل کتاب اور منافقین کو مخاطب نہیں بنایا گیا ہے۔

(۲) مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت ﷺ کو صبر و تسلی کی تلقین اور پچھلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، ان سورتوں میں احکام و قوانین بہت کم بیان ہوئے ہیں۔

(۳) مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی اور مختصر ہیں، اور ان کا اُسلوب بیان زیادہ پُرشکوہ ہے، ان میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے۔

اس کے علاوہ مکی سورتوں کی پہچان کے لئے بعض علماء کے نزدیک چند مخصوص علامات بھی ہیں، جو درج ذیل ہیں :

(۱) مکی سورتوں میں عموماً ''یا ایھا الناس'' (اے لوگو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) ہر وہ سورہ جس میں لفظ ''کلا'' (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

(۳) ہر وہ سورہ جس میں آیتِ سجدہ آئی ہے، مکی ہے۔

(۴) سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورہ جس میں آدم و ابلیس کا واقعہ آیا ہے، مکی ہے۔

مدنی سورتوں کی خصوصیات

مدینہ طیبہ میں چوں کہ ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے، بُت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا؛ اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی اور اسی کے مناسب اُسلوبِ بیان اختیار کیا گیا۔

مدنی آیات اور سورتوں کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں :

(۱) مدنی سورتوں میں زیادہ تر خطاب اہل کتاب اور منافقین سے ہے۔

(۲) مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

(۳) مدنی آیات اور سورتیں طویل اور مفصل ہیں اور ان کا اُسلوبِ بیان مکی سورتوں کی بہ نسبت سادہ ہے۔

اس کے علاوہ مدنی سورتوں کی بعض علامات درج ذیل ہیں :

(۱) مدنی سورتوں میں عموماً ''**یا ایھا الذین آمنوا**'' (اے ایمان والو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) ہر وہ سورہ جس میں جہاد کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

(۳) ہر وہ سورہ جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) قرآن مجید پر نقطے لگانے کا کام کن کے ذریعہ انجام پایا؟

(۲) عربی زبان میں اعراب کی علامتیں کس نے وضع کیں اور قرآن مجید پر ان علامتوں کو کس نے جاری کیا؟

(۳) قرآن مجید میں منزلیں، پارے اور رُکوع کی تعیین کن حضرات نے کی؟

(۴) رموزِ اوقاف سے کیا مراد ہے اور اس کے موجد کون ہیں؟

(۵) قرآن مجید کی پہلی بار پریس میں طباعت کب عمل میں آئی؟

(۶) کچھ اہم اعداد وشمار کے عنوان سے جو اعداد وشمار ذکر کئے ہیں، ان میں سے کم سے کم پانچ کا ذکر کیجئے۔

(۷) کن سورتوں کو مکی سورت کہا جاتا ہے؟

(۸) مکی صورتوں کی خصوصیات کیا ہیں؟

(۹) مدنی سورتوں سے کیا مراد ہے اور ان سورتوں کی کیا خصوصیات ہیں؟

اعجازِ قرآن

معجزہ کے معنی ایسی چیز کے ہیں، جس کو پیش کرنے سے مخلوق عاجز ہو، ــــ کسی چیز کے معجزہ ہونے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں :

اول : یہ کہ مدعیٔ نبوت نے مخالفین کو اس کے مقابلہ کی دعوت دی ہو۔

دوسرے : جن کو چیلنج دیا گیا ہو، ان کے سامنے مقابلہ کرنے کا محرک موجود ہو۔

تیسرے : مقابلہ اور مزاحمت کی کوشش میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

اگر غور کریں تو قرآن مجید میں یہ تینوں باتیں موجود ہیں —— اللہ تعالیٰ نے بار بار چیلنج کیا کہ جو لوگ اس کو خدا کی کتاب نہیں مانتے وہ اس کی نظیر لا کر دکھائیں، کبھی پورے قرآن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اس کی مثال نہیں لا سکتے، کبھی دس سورتیں لانے کا چیلنج کیا گیا اور کبھی کہا گیا کہ اس جیسی ایک ہی سورت لا کر بتادو :

• قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً۔ (اسراء:۸۸)

کہہ دیجئے اگر انسان اور جنات سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں، تب بھی وہ ہرگز نہ لاسکیں گے؛ اگر چہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں؟

• قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللهِ هُوَ أَهْدَى مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (قصص:۴۹)

(اے نبی!) ان سے کہہ دیجئے کہ اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب، جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، اگر تم سچے ہو۔

• أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (ہود:۱۳)

کیا یہ کہتے ہیں کہ (آپ نے) اسے گھڑ لیا ہے، آپ کہہ دیجئے کہ اچھا تو تم بھی دس سورتیں اسی کے مثل گھڑی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم (بُلا) سکتے ہو بُلا لو اگر تم سچے ہو۔

• وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔ (بقرہ:۲۳)

ہم نے جو کتاب اپنے بندہ (محمد رسول اللہ ﷺ) پر اُتاری ہے، اگر اس (کے اللہ کی طرف سے ہونے) میں تم کو شک ہو تو تم اس جیسی ایک سورت بھی لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلالو، اگر تم سچے ہو۔

قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کا محرک بھی موجود تھا؛ کیوں کہ اہل مکہ آپ ﷺ کے نبی ہونے کا انکار کرتے تھے اور آپ کی مخالفت میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی؛ حالاں کہ یہ بات ان کے لئے بہت آسان تھی کہ وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے لوگوں کو قرآن مجید پر ایمان لانے سے روکتے۔

اس چیلنج کے قبول کرنے میں کوئی مانع بھی نہیں تھا؛ کیوں کہ ان کی زبان بھی عربی تھی اور وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان پر ناز کیا کرتے تھے۔

قرآن کا یہ چیلنج اور معجزہ ہونا کس پہلو سے ہے؟ — اس سلسلہ میں اہل علم نے مختلف باتیں کہی ہیں اور ان میں حقیقت و نتیجہ کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

۱- زبان و بیان

یہ بات سبھوں کو تسلیم ہے کہ قرآن مجید زبان و بیان اور بلاغت کے اعتبار سے ایک زبردست معجزہ ہے، اس کا اعتراف ان لوگوں کو بھی تھا، جنھوں نے عہد نبوت میں آپ ﷺ کی بدترین مخالفت کی، اس سلسلہ میں دو مثالیں بہت واضح ہیں: ایک ولید بن مغیرہ کی جو ابوجہل کا بھتیجہ تھا، جس نے قرآن مجید سننے کے بعد کہا:

واللّٰہ ! إن لقوله حلاوة ، وإن عليه لطلاوة ، وإن

أعلاه لمثمر ، وإن أسفله لمعذق ، وإنه ليعلو وما يعلى عليه ۔ (بیہقی فی شعب الایمان، حدیث نمبر: ۱۳۴)

خدا کی قسم! ان کے کلام میں ایک شیرینی ہے، اس پر حسن وشادابی ہے، اس کی شاخیں ثمر آور ہیں اور اس کی جڑ سیراب ہے، یہ بلند رہے گا اور کوئی اس سے بلند نہ ہو سکے گا۔

دوسرا واقعہ عتبہ بن ربیعہ کا ہے، جو مشرکین مکہ کی طرف سے ترجمان بن کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بادشاہت، عورت اور مال وزر کی پیشکش کی تھی، جب آپ نے اس پر قرآن مجید کی چند آیات تلاوت فرمائیں تو ایسا متاثر ہوا کہ قریش کی طرف آنے کے بجائے اپنے گھر چلا گیا اور جب قریش مکہ نے سوال کیا تو بے ساختہ بول اُٹھا :

واللہ ماھو بشعر ، ولا بسحر ، ولا بکھانة ، وقد ناشدته بالرحم أن یکف خشیة أن ینزل بکم العذاب ، وقد علمتم أن محمدا إذا قال شیئاً لم یکذب ۔ (الدر المنثور: ۷/۴۵)

قسم بخدا! یہ کلام نہ تو شعر ہے، نہ جادو اور نہ کہانت، میں نے ان کو رشتہ داری کا واسطہ دیا کہ رُک جائیں، اس خوف سے کہ کہیں تم پر عذاب نازل نہ ہو جائے، تم کو اچھی طرح اس بات کا علم ہے کہ محمد (ﷺ) جب کچھ کہتے ہیں تو غلط نہیں ہوتا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے کی کوشش کی، انھوں نے ایسا مضحکہ خیز کلام پیش کیا، جس کو سن کر عربی کا معمولی زبان داں اور جس کا ترجمہ سن کر ایک عام انسان بھی ہنسے بغیر نہ رہے گا، مثلاً: مسیلمہ کذاب نے قرآن مجید کے مقابلہ میں ایسا کلام پیش کرنے کی کوشش کی، جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس پر (نعوذ باللہ) اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، جیسے اس نے سورۂ کوثر کے مقابلہ یہ عبارت وضع کی :

إنا أعطيناك الجماهر ، فصل لربك وجاهر ، إن شانئك هو الكافر۔

یقیناً ہم نے آپ کو مضبوطی عطا کی ہے؛ لہٰذا اپنے رب کے لئے نماز پڑھئے اور اس کو علی الاعلان کہیے، یقیناً آپ کا دشمن ہی کافر ہے۔

سورۂ عادیات کے اُسلوب پر یہ بے معنی فقرے کہے :

والطاحنات طحناً ، والعاجنات عجناً ، والخابزات خبزاً ، والثاردات ثرداً ، واللاقمات لقما ، إهالة وسمنا ، لقد فضلتم على اهل الوبر ، وماسبقكم أهل المدر ، ريفكم فامنعوه والمقبر فأووه والباغي فناوؤه۔

قسم ہے گیہوں پیسنے والیوں کی اور آٹا گوندھنے والیوں کی اور روٹی پکانے والیوں کی اور ثرید بنانے والیوں کی اور لقمہ بنانے والیوں کی، چربی کو اور گھی کو، تم کو خیمے والوں پر فضیلت دی گئی ہے اور مٹی کے گھر والے تم پر سبقت حاصل نہیں کر سکتے، اپنے دیہات کی حفاظت کرو، ان کو قبر میں پہنچا دو اور باغی کو دور کرو۔

اسی طرح بعض اور لوگوں نے قرآن کے مقابلے میں کچھ کہنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی حماقت کو بے غبار کرنے کے لئے سورۂ فیل کے طرز پر ان سے درج ذیل بے کیف و بے معنی جملے کہلوائے :

الفيل ما الفيل ، وما أدراك ما الفيل ، له ذنب وبيل وخرطوم طويل ، وماذاك من خلق ربنا بقليل۔

ہاتھی، ہاتھی کیا ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ ہاتھی کیا ہے؟ اس کی سخت دُم

ہوتی ہے اور لمبی سونڈ ہوتی ہے، ہمارے پروردگار کی مخلوق میں اس کی کمی نہیں ہے۔

یا یہ فقرے کہلوائے :

الم تر إلى ربک کیف فعل بالحبلى ، أخرج منها نسمة تسعى ، بين شراسيف وحشى ۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے حاملہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس سے چلنے پھرنے والا انسان نکالا، پسلیوں اور پیٹ کے بیچ سے۔

بعد کے ادوار میں بھی بعض ملحدین نے اس قسم کی کوشش کی ہے، جیسے: ابوالعلاء مُعَرّی، ابوالطیب متنبی اور عبداللہ بن الْمُقَفَّع ؛ لیکن ہمیشہ یہ کوشش نامسعود اور نامراد ثابت ہوئی، ابن مقفّع (م: ۱۴۲ھ) جس نے کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ کرکے عربی ادب کی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے، کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے بڑی محنت کے ساتھ قرآن کے مقابلہ میں کچھ لکھنے کی کوشش کی؛ لیکن جب ایک بچے سے قرآن کی یہ آیت سنی :

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِىْ ۔ (ہود: ۴۴)

اور کہا گیا کہ اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا۔

تو جو کچھ لکھا تھا اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور اس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں رہا کہ اس کلام کا مقابلہ ممکن نہیں اور یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر عربی زبان و ادب کے شہسوار انگشت بدنداں ہیں اور اس کا صحیح ادراک وہی لوگ کرسکتے ہیں، جو عربی زبان کا اور اس زبان میں معانی و بلاغت کا ادراک رکھتے ہوں؛ لیکن دو باتیں وہ ہیں جن کو عام لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں، ایک: بعض مفاہیم کے لئے مفردات کا انتخاب یا ایجاد، جیسے :

● بھلائی اور برائی کے لئے عربی زبان میں بہت سے الفاظ ہیں؛ لیکن قرآن نے اس کے لئے ایک نئی اور اچھوتی تعبیر اختیار کی ہے، اور وہ ہے ''معروف'' اور ''منکر'' ——

معروف بھلائی کے لئے اور منکر برائی کے لئے، معروف کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو جانی پہچانی ہو، جس کا لوگوں میں عام چلن اور رواج ہو، اور منکر کے اصل معنی اَن پہچانی چیز کے ہیں، جو خلاف معمول کبھی پیش آجائے، پس نیکی کو معروف کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی سماج میں نیکی کا عام چلن ہونا چاہئے اور منکر سے برائی کو تعبیر کر کے اس جانب اشارہ کیا گیا کہ اگر سماج میں کبھی برائی کا کوئی کام ہو بھی جائے تو وہ خلافِ معمول محسوس ہو۔

● دنیا کی مختلف زبانوں اور مختلف مذہبی کتابوں میں نیز خود عربی زبان میں بھی کسی انسان کی مدد کرنے اور کسی شخص کو کچھ دینے کے لئے مختلف الفاظ مروج رہے ہیں؛ لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے ایک خاص اصطلاح ''زکوٰۃ'' کی استعمال کی ہے، زکوٰۃ کے اصل معنی پاک ہونے کے ہیں، یعنی یہ تصور دیا گیا کہ جب تم کسی غریب بھائی کی مدد کرتے ہو تو تمہارا مال پاک صاف ہو جاتا ہے، پس جیسے انسان کو جسم اور کپڑے کے میل وکچیل کے دور ہونے پر کوئی رنج و افسوس نہیں ہوتا؛ بلکہ خوشی اور مسرت کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح زکوٰۃ دے کر انسان کو خوش ہونا چاہئے نہ کہ رنجیدہ — اس خوبصورت تعبیر کے علاوہ کیا کسی اور لفظ سے یہ مفہوم ادا ہو سکتا ہے؟

● کہیں دو مدمقابل مفہوم کو بیان کرنے کے لئے ایک میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور دوسرے میں واحد کا، اور اس میں گہری معنویت سموئی ہوئی ہے، جیسے ''**من الظلمات إلی النور**'' ظلمات، ظلمت (تاریکی) کی جمع ہے، جس سے گمراہی کے راستوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور نور (روشنی) سے اسلام کی طرف، پہلے لفظ کو جمع لا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ گمراہی کے بہت سے راستے ہیں اور نور کو واحد لا کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ہدایت کا ایک ہی راستہ ہے، اور وہ ہے اسلام۔

● میاں بیوی کے ازدواجی تعلق کے لئے عربی زبان میں متعدد الفاظ ہیں؛ لیکن قرآن نے ایک موقع پر کہا ہے:

فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ۔ (البقرۃ: ۲۲۳)

تو تم اپنی کھیتی پر جس طرح چاہو آؤ۔

اس تعلق کو ''کھیتی پر آنے سے'' تعبیر کر کے بہ یک وقت تین باتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا، اول یہ کہ جیسے ایک کسان کو اپنے ہی کھیت میں کاشتکاری کا حق ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے کھیت میں، اسی طرح ایک مرد کے لئے صرف اپنی منکوحہ ہی سے یہ تعلق جائز ہے، دوسرے: اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ جنسی انتفاع اس طور پر ہونا چاہئے کہ وہ فطری راستے میں ہو؛ کیوں کہ جب ہی اس کو اولاد کی شکل میں پیداوار حاصل ہو سکتی ہے، اس کے لئے غیر فطری راستہ اختیار کرنا جائز نہیں، تیسرے: کسی شوہر کے لئے اپنی بیوی سے تعلق کا مقصد صرف جنسی خواہش کی تکمیل نہ ہونی چاہئے؛ بلکہ حصولِ اولاد ہونا چاہئے۔

یہ تو چند مثالیں کسی خاص انتخاب کے بغیر ہیں، ورنہ قرآن مجید کے جس لفظ کو جہاں سے اُٹھایئے، ایسا لگتا ہے کہ ایک دُرّ بے بہا ہے اور اس کو جہاں رکھا گیا ہے، وہی اس کی جگہ ہے۔

دوسری بات جس کو عام لوگ بھی محسوس کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی، وہ ہے کسی تکلف اور تصنع کے بغیر قرآن مجید کے الفاظ اور فقروں کے درمیان صوتی آہنگ، یہ وہ چیز ہے کہ ایک ایسا شخص جو عربی زبان سے بالکل واقف نہیں ہوتا، وہ بھی جب قرآن کی تلاوت کرتا ہے یا قراءت کو سنتا ہے تو عش عش کرتا ہے۔

- جیسے کہیں آیات کا ایسا تسلسل، جس میں ہر آیت کا اختتام ''و، ن'' پر ہوتا ہے، جیسے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ هُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ ۔ (مومنون: ۱-۱۱)

- کہیں ایسی آیات کا سلسلہ جن کے اخیر میں ''یاء'' اور ''نون'' یا اس کے ہم وزن الفاظ آئے ہیں، جیسے: سورۂ انبیاء، آیت نمبر: ۶۸ تا ۹۱۔
- کہیں اخیر میں الف اور اس سے پہلے زبر والا حرف، جیسے سورہ نبا آیت: ۶ سے لے کر سورت کے ختم تک ایک ہی طرح کا آہنگ: ''مہادا، ازواجا، سباتا، لباسا، معاشا، شدادا'' وغیرہ۔
- کہیں فقرے تاء تانیث پر ختم ہوتے ہیں، جیسے سورۂ تکویر اور سورۂ انفطار کی ابتدائی آیات۔

● کہیں اخیر میں ''ھا'' کا اختتامیہ، جیسے پوری کی پوری سورۃ ''شمس'' — غرض کہ پورے قرآن مجید میں تقریباً ہر سورت اور ہر رُکوع کا ایک الگ منفرد اور خوبصورت آہنگ پایا جاتا ہے، جو پڑھنے والے کو نہ کبھی سیر ہونے دیتا ہے اور نہ سننے والے میں کبھی اس سے اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے، یہ محض خوش عقیدگی نہیں ؛ بلکہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ عربی زبان کا ایک حرف نہیں جانتے ؛ بلکہ بعض وہ لوگ جو قرآن مجید پر ایمان بھی نہیں رکھتے ، وہ بھی جب قرآن کو سنتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ان کے اندر قرآن مجید کو سننے کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

۲- فطرت سے ہم آہنگ قانون

قرآن کے اعجاز کا ایک دوسرا پہلو وہ ''قوانین'' ہیں، جن کو قرآن نے پیش کیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآن کی تعلیمات پوری طرح انسانی فطرت اور ضرورت و مصلحت سے ہم آہنگ ہیں اور آج پوری دنیا قرآن کے پیش کئے ہوئے دستورِ حیات سے خوشہ چینی پر مجبور ہے، یوں تو تجربہ سے زندگی کے تمام ہی شعبوں میں اسلامی قانون کی افادیت واضح ہوچکی ہے؛ لیکن یہاں چند مثالوں کے تذکرہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے :

● دنیا کے اکثر مذاہب اور قوانین میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میاں بیوی کے درمیان کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو، مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے، اس کے نتیجہ میں اخلاقی قدریں بھی پامال ہوتی تھیں اور بعض اوقات عورتوں کی جان کے لالے بھی پڑ جاتے تھے، قرآن نے نہ صرف طلاق کی اجازت دی ؛ بلکہ اس کے لئے منصفانہ طریقۂ کار کی بھی رہنمائی کی ، ہندومت اور عیسائیت دنیا کے دو بڑے مذاہب ہیں ، ان کے یہاں طلاق کا کوئی تصور نہیں تھا ؛ لیکن ان مذاہب کے بہ شمول آج دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین میں طلاق کی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

● اکثر مذاہب میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی گنجائش نہیں تھی، قرآن نے نہ صرف

اس کی اجازت دی ہے؛ بلکہ اس کی تلقین کی ہے، آج اس قانون کی معقولیت سے اور اس کے مبنی بر انصاف ہونے سے کوئی سمجھدار آدمی انکار کر سکتا ہے؟

● بیشتر قوانین میں خواتین کے لئے حق میراث نہیں تھا، یا تو بڑے بیٹے کو میراث ملتی تھی، یا بالغ بیٹے کو، یا زیادہ سے زیادہ سب بیٹوں کو؛ لیکن اسلام نے عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا اور آج پوری دنیا میں عورتوں کے لئے میراث کے استحقاق کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔

● قرآن مجید نے سخت جرائم پر جسمانی سزائیں مقرر کی ہیں، آج ماہر نفسیات اس بات پر متفق ہیں اور جرائم کے اعداد و شمار اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ جسمانی سزائیں ہی مجرم کو جرم سے روکنے میں مؤثر ہوتی ہیں۔

● قرآن نے قتل اور جسمانی زیادتی کی سزا میں مجرم کے قتل کے مقابلہ قتل اور جسمانی نقصان کے مقابلہ اسی قدر نقصان کا حکم دیا ہے، جس کو ''قصاص'' سے تعبیر کیا گیا ہے ''**وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ**'' (البقرۃ:۱۷۹) — یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ قاتل کے لئے قتل کی سزا ہی مؤثر ہوتی ہے؛ چنانچہ کئی ملکوں میں سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اسے جاری کیا گیا ہے۔

● قرآن نے مالیاتی قوانین کے ضمن میں اس بات کی تلقین کی ہے کہ مالیاتی معاملات تحریری شکل میں ہونے چاہئیں :

إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔ (البقرۃ:۲۸۲)

جب تم کسی مقررہ مدت کے لئے اُدھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور اس کو تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

آج پوری دنیا میں اکاؤنٹ کے تحریری ریکارڈ کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

غرض کہ آپ قانون کے جس شعبہ کو بھی دیکھیں، قرآن مجید کا پیش کیا ہوا قانون انسانی

فطرت اور ضرورت سے حد درجہ مربوط ہے، صحرائے عرب کے ایک اُمی شخص کے لئے یہ بات کیوں کر ممکن ہوسکتی ہے کہ وہ ایک ایسا قانون وضع کرے، جو قیامت تک متمدن دنیا کی رہنمائی کرتا رہے اور جس میں تمام مفاسد کا علاج موجود ہو؟ —— یہ یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں؛ بلکہ خود خالق کائنات کا برحق کلام ہے۔

۳۔ قصص و واقعات

قرآن مجید نے ماضی کے ان قصص و واقعات کو بھی بیان کیا ہے، جن سے عالم عرب میں کوئی شخص واقف نہیں تھا، نہ ان کے اشعار میں کہیں اس کا ذکر آتا تھا اور نہ ان کے یہاں مروج کہانیوں میں اس کا کوئی سراغ تھا، مکی زندگی میں یہود ونصاریٰ کے علماء سے آپ کی کوئی ایسی طویل ملاقات نہیں ہوئی، جس میں انسان ایک دوسرے کی معلومات سے واقف ہوتا ہے، مدینہ جانے کے بعد اگر چہ کہ یہودیوں سے آپ کا سابقہ رہا؛ لیکن آپ ﷺ کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مخاصمانہ تھا اور زیادہ تر وہ آپ ﷺ کی نبوت کا امتحان لینے کے لئے اُلٹے سیدھے سوالات کیا کرتے تھے، اس کے باوجود آپ نے انبیاء بنی اسرائیل اور ان سے پہلے کے واقعات کو قرآن مجید میں بڑے خوبصورت پیرایہ میں پند وموعظت کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں بعض قصص تو ایسے ہیں کہ جن کا خود تورات یا انجیل میں بھی ذکر نہیں ہے، یا وہ حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد کے ہیں، جیسے: اصحاب کہف کا واقعہ، ذوالقرنین کا واقعہ، اصحاب اخدود کا قصہ وغیرہ۔

پھر بعض واقعات کے بیان میں قرآن نے گذشتہ آسمانی کتابوں کی تحریفات کو سامنے رکھ کر گفتگو کی ہے، جیسے تورات کے بیان کے مطابق خدا نے چھ دنوں میں کائنات کی تخلیق کی اور چوں کہ اس تخلیقی عمل نے اسے تھکا دیا تھا؛ اس لئے ساتویں دن اس نے آرام کیا، (پیدائش:۲:۲) قرآن مجید نے چھ دن میں کائنات کی تخلیق کا ذکر کیا ہے؛ لیکن اس کے بعد کہا ہے کہ اللہ تھکتے نہیں ہیں، (ق:۳۸) مقصد یہ ہے کہ ساتویں دن اللہ کے آرام کرنے کا ذکر درست نہیں ہے؛ کیوں کہ تھک جانا خالق کی شان نہیں ہے۔

یا جیسے تورات میں حضرت سلیمان ﷺ کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے، قرآن نے حضرت سلیمان ﷺ کے بارے میں کہا ہے: ''**وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا**'' (البقرۃ: ۱۰۲) اس طرح ایک پیغمبر کی زندگی پر جو غبار ڈالا گیا تھا، قرآن نے اسے صاف کردیا ہے — حضرت یوسف ﷺ کی طرف بھی تورات نے گناہ کی نسبت کی ہے، قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ گناہ تک پہنچے نہیں تھے: ''**وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ**''۔ (یوسف: ۲۴)

غرض کہ ان واقعات کو براہ راست یا کسی خاص شخص سے معلوم کرنے کا آپ ﷺ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا، آپ ﷺ اُمی تھے، لکھی ہوئی باتیں پڑھ نہیں سکتے تھے، کسی یہودی یا عیسائی عالم سے آپ ﷺ کا تعلق نہیں تھا، پھر اگر ہوتا بھی تو آپ صرف سنے سنائے واقعات بیان کرسکتے تھے، اس سلسلہ میں گذشتہ تحریف شدہ کتابوں میں جو غلط بیانی کی گئی تھی، اس پر کیسے تنبیہ فرماسکتے تھے؟

۴- پیشین گوئیاں

قرآن کریم نے مختلف اُمور کی پیشین گوئی بھی کی، یہ پیشین گوئی بہ ظاہر ناموافق حالات میں کی گئی؛ لیکن وہ غیر معمولی طور پر پوری ہوئی، اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

- نزولِ قرآن کے وقت جزیرۃ العرب کے دوطرف دو بڑی طاقتیں تھیں، مشرق کی طرف ایرانی بادشاہت اور مغرب کی طرف رومی بادشاہت، ایرانی مشرک اور آتش پرست تھے؛ اس لئے ان کی فتح مشرکین مکہ کے لئے باعثِ مسرت ہوتی تھی، رومی عیسائی تھے اور کسی نہ کسی درجہ توحید کے قائل تھے؛ اس لئے رومیوں کی کامیابی مسلمانوں کے لئے اطمینان کا باعث ہوتی تھی اور وہ اسے عقیدۂ توحید کے غلبہ کے سلسلہ میں فالِ نیک تصور کرتے تھے، جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا، اس وقت ایرانی فوج پے بہ پے رومیوں کو شکست دے رہی تھی، اس نے رومیوں کے اکثر شہر فتح کرلئے تھے، یہاں تک کہ وہ روم کے دارالحکومت

قسطنطنیہ تک پہنچ گئے تھے، اس وقت بہ ظاہر اس بات کی کوئی اُمید نہیں تھی کہ رومی دوبارہ ایران کے مقابلہ کھڑے ہوسکیں گے، ان حالات میں سورۂ روم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں :

الٓمّٓ ، غُلِبَتِ الرُّوْمُ ، فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ، فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ، لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ، وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (الروم:۱-۶)

رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے، اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی، اور وہ دن وہ ہوگا کہ جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے، اللہ نصرت عطا فرماتا ہے، جسے چاہتا ہے، اور وہ زبردست اور رحیم ہے، یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے، اللہ کبھی اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اس آیت میں نہ صرف رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی کی گئی؛ بلکہ یہ بھی فرمایا گیا کہ یہ فتح صرف ''بِضْعِ سِنِيْنَ''، یعنی تین سے نو سال کے اندر رومیوں کو حاصل ہوجائے گی، یہ خبر اس وقت اتنی خلافِ توقع تھی کہ اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شرط باندھ لی، مگر ظاہری حالات کے خلاف رومیوں نے ہجرت کے دوسرے سال ۶۲۲ء میں ایرانیوں کو شکست فاش دے کر اپنے سارے علاقے واپس لے لیے، یہی وہ وقت تھا، جب غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے مقابلہ اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود فتح وکامرانی حاصل ہورہی تھی، قرآن نے ''يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ'' (جس دن کہ ایمان

والے اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے) کا وعدہ بھی کیا تھا، گویا کہ سورۂ روم کی ان آیات میں بیک وقت دو پیشین گوئیاں تھیں، دونوں ظاہری حالات کے خلاف تھیں اور دونوں ہی پوری ہوئیں۔

● اس وقت کا تصور کیجئے ! جب آپ ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ پہنچے، جب ہجرت کے دوران آپ مقامِ جُحفہ پر پہنچے، جہاں سے مکہ کی طرف راستہ نکلتا تھا تو فطری طور پر وطن اور مکہ جیسے مقدس وطن کی جدائی پر آپ کو ملال ہوا، اس موقع پر قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی :

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ۔ (١)

اے نبی یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے، وہ تمہیں تمہاری مانوس جگہ (یعنی مکہ مکرمہ) کو واپس لے جانے والا ہے۔

غور کیجئے کہ کیا اس وقت دوبارہ مسلمانوں کے مکہ پہنچنے کا کوئی تصور بھی کیا جا سکتا تھا؛ لیکن ٹھیک اس آیت کے نازل ہونے کے آٹھ سال بعد مسلمان مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔

● رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ عمرہ کر رہے ہیں، نبی کا خواب چوں کہ وحی کے درجہ میں ہوتا ہے؛ اس لئے آپ نے عمرہ کے لئے سفر کا اعلان فرما دیا؛ لیکن اہل مکہ نے رکاوٹ پیدا کی، صلح حدیبیہ کے بعد آپ واپس ہو گئے اور اگلے سال عمرۃ القضا فرمایا، اس خواب کو دیکھنے کے بعد قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں :

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُؤُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِن دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحاً قَرِيْباً۔ (٢)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا، جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا، انشاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ

(١) القصص:٨٥۔ (٢) الفتح:٢٧۔

داخل ہوگے، اپنے سر منڈاؤ گے، بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہیں ہوگا اور وہ اس بات کو جانتا تھا، جسے تم نہیں جانتے تھے؛ اس لئے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی۔

بہ ظاہر اس وقت اس بات کی توقع نہیں تھی کہ جو مسلمان مکہ سے بے یارومددگار نکال دیئے گئے ہیں، وہ پھر دوبارہ اس شہر میں داخل ہوں گے، مامون رہیں گے اور عمرہ کا فریضہ انجام دیں گے؛ لیکن اگرچہ پہلے سال مسلمان عمرہ نہیں کرسکے؛ لیکن اگلے ہی سال یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

- اسی طرح قرآن نے پیشین گوئی کی کہ من جانب اللہ یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہے گی:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔ (الحجر:۹)

اس نصیحت نامہ کو ہم نے اُتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

کون خیال کرسکتا تھا کہ جس طرح دوسری مذہبی کتابیں تہ و بالا کردی گئیں اور انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں نے ان کی اصل شکل بدل کر رکھ دی، قرآن مجید اس سے محفوظ رہ سکے گا؛ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح کتنی ہی بار مسلمانوں نے شکست کا سامنا کیا، آبادی کی آبادی نذر آتش کردی گئی، کتب خانے جلادیئے گئے اور بستی کی بستی قتل عام میں تہ تیغ کردی گئی؛ لیکن اس کے باوجود ایک حرف کے فرق کے بغیر قرآن مجید آج تک محفوظ ہے، نہ صرف کتابوں میں محفوظ ہے؛ بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں نے اسے محفوظ کر رکھا ہے اور صرف قرآن کے الفاظ ہی محفوظ نہیں رہے؛ بلکہ قرآن کا رسم الخط، قرآن کی صحیح تشریحات، عربی زبان اور نزولِ قرآن کے زمانے کے اُسلوب بیان کی بھی من جانب اللہ حفاظت کی گئی۔

اس کے علاوہ بھی قرآن کی متعدد پیشین گوئیاں ہیں، جو بہ ظاہر ناموافق حالات میں دی گئیں؛ لیکن غیر معمولی طور پر اللہ نے ان کو پورا فرمایا۔

۵- سائنسی حقائق

قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ایک اہم پہلو وہ سائنسی اور کائناتی حقائق ہیں، جن سے

قرآن نے پردہ اُٹھایا ہے اور جن کا نزول قرآن کے زمانے میں کوئی تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، قرآن مجید میں اس طرح کی بہت سی آیات ہیں، یہاں چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے :

● سائنس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات کا ایک ہی وجود تھا، ایک دھماکہ کے ذریعہ اس کے حصے بکھرے ہوئے اور اس طرح وہ نظام شمسی وجود میں آیا، جس کا حصہ یہ عالم ارض ہے، قرآن مجید نے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا ۔ (الانبیاء:۳۰)

کیا جولوگ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں، انھیں علم نہیں کہ آسمان وزمین جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے دونوں کو توڑ کر الگ کردیا۔

● قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْئٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ (الانبیاء:۳۰)

اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے، سو کیا پھر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟

آج یہ بات تجربہ ومشاہدہ میں آچکی ہے کہ زمین پر موجود تمام حیوانات اور نباتات کی زندگی پانی پر موقوف ہے، اسی طرح جب پانی کا درجۂ حرارت کم ہوتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں آکسیجن کو محفوظ کرلیتا ہے اور جب منجمد ہوتا ہے تو آکسیجن خارج کرتا ہے، جس سے سمندری جانوروں کو اپنی زندگی کے بچانے میں مدد ملتی ہے۔

● ایک عرصہ تک سائنس دانوں کی رائے تھی کہ "ذرہ" (Atom) ناقابل تقسیم ہے، گذشتہ صدی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "ایٹم" بھی تقسیم ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ وہ بھی پروٹون، نائیٹرون اور الیکٹرون پر مشتمل ہوتا ہے، سائنس کی دنیا میں اس سے ایک انقلاب آگیا، یہی تحقیق نیوکلیر بم کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی، اب قرآن مجید کی اس آیت کو ملاحظہ کیجئے جو بتاتی ہے کہ ذرہ بھی تقسیم ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ "ذرہ" سے چھوٹی شئے بھی کائنات میں موجود ہے :

وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْأَرْضِ وَلاَ فِی السَّمَاءِ وَلاَ أَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَلاَ أَکْبَرَ إِلاَّ فِی کِتَابٍ مُّبِیْنٍ۔ (یونس:۶۱)

اور آپ کے پروردگار سے ذرہ برابر (بھی کوئی چیز) غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹی نہ بڑی، مگر یہ سب کتابِ مبین میں ہے۔

● موجودہ دور کے سائنسی اکتشافات میں یہ بھی ہے کہ جب انسان فضاء میں بلندی کی طرف چڑھتا ہے تو آکسیجن کم ہونے لگتی ہے، جہازوں اور راکٹوں کے سفر میں مسافر اس کا تجربہ کرتے ہیں، نزولِ قرآن مجید کے زمانہ میں نہ فضائی سواریاں تھیں، نہ انسان نے چاند اور مریخ تک رسائی حاصل کی تھی؛ لیکن اسی وقت قرآن مجید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا :

وَمَن یُرِدْ أَن یُضِلَّهُ یَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَیِّقاً حَرَجاً کَأَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَاءِ۔ (الانعام:۱۲۵)

اور جس کے لئے وہ ارادہ کرلیتا ہے کہ اسے گمراہ رکھے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کردیتا ہے، جیسے اس کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو۔

● قدیم ترین عہد سے انسان یہ تصور کرتا رہا ہے کہ مذکر و مؤنث کا نظام صرف جانداروں میں ہے؛ لیکن سائنس کی موجودہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ نظام نباتات میں بھی ہے اور جمادات میں بھی، یہاں تک کہ الیکٹرک کی پیدائش میں بھی مثبت اور منفی پہلوؤں کا دخل ہوتا ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہا ہے :

وَمِن کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔ (۱)

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام مخلوقات میں نر و مادہ کا، یا کم سے کم جوڑے کا وجود پایا جاتا ہے :

(۱) الذاریات:۴۹۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (یٰسین:۳٦)

وہ ذات جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے، خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس یعنی نوعِ انسانی میں سے، یا ان اشیاء میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

یہ دوسری آیت صراحت کرتی ہے کہ نر و مادہ کا نظام نباتات میں بھی ہے، انسانوں میں بھی، اور ایسی چیزوں میں بھی جن کے بارے میں انسان کو کوئی علم نہیں تھا۔

● سائنس نے ثابت کیا ہے کہ 'جنین' جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو بہ ظاہر وہ ایک غلاف میں نظر آتا ہے؛ لیکن حقیقت میں وہ تین باریک جلدوں میں ہوتا ہے، ان جھلیوں کے الگ الگ نام "Endo Derm, Meso Derm, Ecto Derm" بھی دیئے گئے ہیں، قرآن نے غالباً اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :

یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ أُمَّهَاتِکُمْ خَلْقاً مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۔ (الزمر:٦)

وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔

''ظلمت'' کے اصل معنی تاریکی کے ہیں، یہ یہاں حجاب کے ہم معنی ہے؛ کیوں کہ یہ جھلی روشنی کو اندر پہنچنے سے روکتی ہے۔

● پودوں میں ہوا کے ذریعہ نر پودے کے مذکر اعضاء مادہ پودے میں منتقل ہوتے ہیں اور اس طرح وہ بار آور ہوتے ہیں، عربی زبان میں بار آور کرنے کو ''تلقیح'' کہتے ہیں، غالباً قرآن مجید کی اس آیت میں ''لواقح'' کی تعبیر سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

وَأَرْسَلْنَا الرِّیَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَیْنَاکُمُوْهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِیْنَ ۔ (الحجر:۲۲)

● جدید میڈیکل سائنس نے ثابت کیا ہے کہ جاندار کا مادۂ منویہ بہت سے زندہ جراثیم پر مشتمل ہوتا ہے، جن کو مائیکرواسکوپ کی مدد سے ہی دیکھا جاسکتا ہے، ان جراثیم کا سر بھی ہوتا ہے، گردن بھی ہوتی ہے اور دم بھی ہوتی ہے، یہ اپنی شکل میں جونک کے مشابہ ہوتا ہے، جس کو عربی زبان میں ''علقہ'' کہتے ہیں، قرآن مجید نے اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کس طرح اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ (العلق:۱-۲)

پڑھو (اے نبی!) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے (جو جونک کی شکل کا ہوتا ہے) انسان کی تخلیق کی۔

صرف یہی نہیں؛ بلکہ انسان جن تخلیقی مراحل سے گذرتا ہے اور جن کو موجودہ سائنس نے واضح کیا ہے، قرآن مجید نے ٹھیک اسی طرح انسان کے تخلیقی مراحل کا ذکر فرمایا ہے۔ (المومنون:۱۴)

● اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں مختلف ایسی چیزیں رکھی ہیں، جن سے اس کی شناخت متعلق ہے، جیسے: شکل وصورت، آواز، رنگ، جسم پر پائی جانے والی بعض علامات، انسان ابتداء آفرینش سے ہی اس سے واقف ہے؛ لیکن انیسویں صدی میں اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ انسان کی انگلیوں پر جو نشانات ہیں، وہ ہر انسان کا دوسرے انسان سے الگ ہے، قرآن مجید اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ ، بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰی اَنْ نُسَوِّیَ بَنَانَهُ ۔ (القیامۃ:۳-۴)

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنادینے پر قادر ہیں۔

خاص طور پر انگلیوں کے پور کا ذکر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس سے بھی ایک انسان کی شناخت متعلق ہوتی ہے۔

غرض کہ قرآن مجید آپ اپنے کتابِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے اور ابدی معجزہ ہے:

- زبان و بیان کے اُسلوب کے لحاظ سے۔
- حکیمانہ قانون کے لحاظ سے۔
- گذشتہ قصص وواقعات کے بیان کے اعتبار سے۔
- مستقبل کی پیشین گوئیوں کے اعتبار سے۔
- سائنسی حقائق سے پردہ اُٹھانے کی جہت سے۔

ترجمۂ قرآن

قرآن مجید کے معنی ومفہوم کو غیر عربی زبان میں منتقل کرنے کو ''ترجمہ'' کہتے ہیں، ترجمہ کی دوصورتیں ہیں: ترجمۂ تفسیریہ، ترجمہ حرفیہ۔

''ترجمۂ تفسیریہ'' سے مراد ہے کہ الفاظ قرآنی کی پابندی کئے بغیر مفہوم و مراد کی وضاحت کردی جائے، جس کو اُردو زبان میں عام طور پر 'تفسیر' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے جائز ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید تمام انسانیت کے لئے ہدایت ہے، اگر دوسری زبانوں میں قرآن مجید کی تشریح وتوضیح نہ ہوسکے، تو جو لوگ عربی زبان سے واقف نہیں ہیں، وہ کس طرح قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرسکتے ہیں؟

''ترجمہ حرفیہ'' سے مراد ہے لفظ بہ لفظ قرآن مجید کا معنی لکھنا، خواہ ٹھیٹھ لفظی ترجمہ ہو یا سلیس وبامحاورہ — اس دوسرے ترجمہ کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف تھا کہ قرآن مجید کا ایسا ترجمہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ قرآن ایک معجزاتی کلام ہے اور قرآن مجید کی اعجازی کیفیت عربی الفاظ ہی میں پنہاں ہے، دوسری زبان میں قرآن مجید کے لفظی حسن و جمال اور اثر انگیزی کی صلاحیت کو منتقل کرنا ممکن نہیں۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ اگرچہ قرآن مجید کے کلمات اور فقروں کی خوبصورتی اور تاثیر کو کسی اور زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن قرآن مجید کا پیغام — جو اس کا اصل مقصد ہے — کو تو منتقل کیا جاسکتا ہے، ہمارے زمانہ میں تقریباً اسی نقطۂ نظر پر اہل علم کا اتفاق ہو چکا ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مشہور فقیہ علامہ سرخسیؒ کے بقول حضرت سلمان فارسی ؓ نے اہل فارس کے لئے فارسی زبان میں سورۂ فاتحہ کا ترجمہ کیا تھا۔

البتہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے والا عربی زبان سے، اس کے گرامر اور اس کے اُسلوب بیان سے بھی واقف ہو اور اس زبان سے بھی جس میں وہ ترجمہ کر رہا ہے، ترجمہ میں قرآن کے ہر ہر لفظ کا معنی نقل کیا جائے، کسی لفظ کو چھوڑا نہ جائے، نیز پوشیدہ ضمیروں اور ترکیبی حیثیتوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے، نیز ترجمہ متن قرآن کے ساتھ ہو، ایسا نہ ہو کہ صرف ترجمہ چھاپ دیا جائے اور متن قرآن کو چھوڑ دیا جائے؛ یہ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن پڑھنے والوں کا رشتہ قرآن مجید سے قائم رہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کا متن عربی زبان میں ہی لکھا جائے؛ کیوں کہ دوسری زبانوں میں عربی تلفظ ادا نہیں کیا جاسکتا۔

ان سب رعایتوں کے ساتھ بھی قرآن کا جو ترجمہ ہوگا، وہ خود قرآن مجید کے حکم میں نہیں ہوگا، نماز میں اس کا پڑھنا کافی نہیں ہوگا، جیسا کہ جمہور فقہاء کا اور حنفیہ کا راجح قول ہے، ترجمہ کے پڑھنے پر تلاوت کا اطلاق کرنا درست نہیں ہوگا اور تنہا ترجمہ کو بغیر وضو کے ہاتھ لگانے کی گنجائش ہوگی۔

تمرینی سوالات

(۱) اعجازِ قرآن سے کیا مراد ہے اور قرآن پاک کو کیوں معجزہ کہا جاسکتا ہے؟

(۲) زبان و بیان کے اعتبار سے قرآن مجید کے اعجاز کو کم سے کم اور مثالوں کے ذریعہ واضح کیجئے۔

(۳) مفردات قرآنی کی اہمیت و معنویت کو مثال کے ذریعہ بیان کیجئے۔

(۴) کتاب میں کہا گیا ہے کہ اعجازِ قرآن کا ایک پہلو اس کا قانونِ فطرت کا پوری طرح ہم آہنگ ہونا ہے، اس کی کم سے کم دو مثالیں پیش کیجئے۔

(۵) کلام مجید نے بائبل کے بعض قصص وواقعات کی تصحیح کی ہے، کم سے کم اس کی ایک مثال لکھئے۔

(۶) قرآن مجید کی بعض پیشین گوئیاں ظاہری حالات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں؛ لیکن وہ بعینہٖ ظاہر ہوئیں، اس کی ایک دو مثال پیش کیجئے۔

(۷) قرآن مجید کا ایک اعجازی پہلو یہ ہے کہ کائنات سے متعلق اس کی باتیں حیرت انگیز طور پر موجودہ سائنسی تحقیقات کے مطابق ہیں، ان کی کم سے کم تین مثالیں دیجئے۔

(۸) ترجمہ تفسیریہ اور ترجمہ حرفیہ سے کیا مراد ہے اور ترجمہ تفسیریہ کا کیا حکم ہے؟

●●●

لغوی معنی واصطلاحی تعریف

تفسیر کا مادہ ''ف، س، ر'' ہے، جس کے معنی واضح کرنے اور کھولنے کے ہیں، علم تفسیر سے معانیٔ قرآنی کی وضاحت ہوتی ہے؛ اس لئے اسے ''تفسیر'' کہتے ہیں۔

تفسیر کی فنی تعریف کے سلسلہ میں اہل علم نے مختلف باتیں لکھی ہیں؛ لیکن ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے، اس سلسلہ میں علامہ بدر الدین زرکشی کی تعریف بہت واضح ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں :

علم يفهم به كتاب الله المنزل على نبيه محمد صلى الله عليه وسلم و بيان معانيه ، واستخراج أحكامه وحِكَمه ۔

وہ علم جس سے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو سمجھا جائے، اس کی مرادات کو واضح کیا جائے اور اس سے احکام اور حکمتوں کا استخراج کیا جائے۔

اس تعریف میں قرآن سے متعلق سارے علوم شامل ہیں، علم قراءت، اسباب نزول، مفردات القرآن کا علم، قرآن کی ترکیبی حیثیت کا علم، جو نحو وصرف اور معانی وبیان کے جاننے پر موقوف ہے اور قرآن سے احکام کا اخذ واستنباط اور اس کے قصص وواقعات اور آیاتِ منسوخہ سے آگہی؛ کیوں کہ ان سب کو جانے بغیر معانی قرآن کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

تفسیر سے قریبی ایک اور لفظ ''تاویل'' ہے، ''اَول'' کے معنی رجوع کرنے کے ہیں، جب کسی کلام کی وضاحت کرنی ہوتی ہے، تو الفاظ کے راستہ سے معانی کی طرف رجوع کیا جاتا

ہے، اسی مناسبت سے تشریح قرآنی کے لئے تاویل کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے —— اس میں اختلاف ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے تفسیر اور تاویل ایک ہی ہے، یا دونوں میں کچھ فرق ہے؟ زیادہ تر لوگوں کا رجحان ہے کہ ابتدائی دور میں تو تفسیر اور تاویل کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا تھا؛ لیکن بعد کے ادوار میں ان دونوں اصطلاحات کے درمیان تھوڑا سا فرق کیا جانے لگا، تفسیر و تاویل کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، مگر زیادہ تر اہل علم کا رجحان امام ابوالمنصور ماتریدی کے قول کی طرف ہے کہ آیات کے متبادر معنی کو بیان کرنا اور آیات کے واضح مفہوم کو نقل کرنا 'تفسیر' ہے اور آیت سے دلیل کی بنیاد پر ایسا معنی مراد لینا، جس کی طرف بلا تأمل ذہن کا تبادر نہ ہوتا ہو، یا جس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو، ان میں سے ایک معنی کو متعین کرنا 'تاویل' ہے۔

ویسے یہ محض تعبیری اختلاف ہے، قرآن کی تشریح و توضیح پر اس اختلاف کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تفسیر —— عہدِ نبوی و عہدِ صحابہ میں

رسول اللہ ﷺ کے ذمہ صرف قرآن مجید کو پہنچانا ہی نہیں تھا؛ بلکہ اس کی تشریح بھی آپ کی ذمہ داری تھی؛ اس لئے تفسیر قرآن کا آغاز آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے ہوتا ہے؛ چنانچہ کتبِ حدیث میں تفسیر سے متعلق مستقل ابواب قائم کئے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں کتنی ہی حدیثیں حضور ﷺ سے نقل کی گئی ہیں؛ بلکہ پورا ذخیرۂ حدیث ہی الفاظِ قرآنی کی تشریح یا اس کے مجمل احکام کی توضیح ہے۔

حضور ﷺ سے براہِ راست قرآن مجید کو صحابہ ﷺ نے سمجھا ہے؛ اس لئے صحابہ ﷺ میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جن سے قرآن مجید کی تشریح و توضیح منقول ہے؛ لیکن دس صحابہ وہ ہیں، جن کو اس فن میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان کے نام یہ ہیں :

(۱) حضرت ابوبکر صدیق ﷺ (۲) حضرت عمر فاروق ﷺ
(۳) حضرت عثمان غنی ﷺ (۴) حضرت علی مرتضیٰ ﷺ
(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ (۶) حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ

(۷) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

(۹) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (۱۰) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

پھر ان صحابہ میں حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے زیادہ تفسیری روایات منقول ہیں، خاص کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو تو خود حضور ﷺ نے ''ترجمان القرآن'' کا خطاب دیا ہے، اور ان کی تفسیری مرویات سب سے زیادہ تفسیر کی کتابوں میں منقول ہیں؛ لیکن محدثین کے نزدیک ان میں سے بہت کم روایتیں قابل اعتبار ہیں۔

ان صحابہ سے زیادہ تر جو تفسیری روایات منقول ہیں، ان کی سندیں مختصر طور پر ذکر کی جاتی ہیں؛ تاکہ ان کی تفسیری روایات میں سے معتبر اور نامعتبر مرویات کا ایک حد تک اندازہ ہو سکے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مرویات

(۱) معاویہ بن صالح ← علی بن ابی طلحہ ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۲) قیس بن مسلم کوفی ← عطاء بن السائب ← سعید ابن جبیر ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۳) محمد ابن اسحاق ← محمد بن ابی محمد مولیٰ آلِ زید بن ثابت ← عکرمہ ← سعید بن جبیر ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۴) اسماعیل بن عبدالرحمن سُدّی کبیر ← ابو مالک ← ابوصالح ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۵) عبدالملک بن جُریج ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۶) ضحاک بن مُزاحم ہلالی ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۷) عطیہ عوفی ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۸) مقاتل بن سلیمان خراسانی ← مجاہد ← ضحاک ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۹) محمد بن سائب کلبی ← ابوصالح ← عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

ان میں سے پہلی سند حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مرویات میں سب سے قوی سمجھی گئی ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی سند کی مرویات کو اپنی کتاب میں تعلیقاً نقل کیا ہے،

دوسری سند بھی معتبر ہے، جسے بخاری و مسلم کے معیار پر مانا گیا ہے، تیسری سند حسن کے درجہ کی ہے؛ البتہ پہلی دو سندوں سے کم تر سمجھی گئی ہے، چوتھی اور پانچویں سندیں قابلِ تحقیق ہیں، نہ اِن اَسناد کی تمام مرویات معتبر ہیں اور نہ تمام مرویات نامعتبر ہیں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں سندیں ضعیف اور نامعتبر سمجھی گئی ہیں — یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کی تفسیری مرویات کو علامہ ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی مصنف: ''القاموس المحیط'' نے ''تنویر المقیاس'' کے نام سے جمع کیا ہے، یہ روایتیں محمد بن سائب کلبی کے واسطے سے ہیں، جن کو محدثین نے نہ صرف ضعیف مانا ہے؛ بلکہ ان کو واضع حدیث بھی قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کی مرویات

(۱) اَعمش ← ابوالضحیٰ ← مَسروق ← عبداللہ بن مسعود ﷺ۔

(۲) مجاہد ← ابومَعْمَر ← عبداللہ بن مسعود ﷺ۔

(۳) اَعمش ← ابووائل ← عبداللہ بن مسعود ﷺ۔

(۴) سُدّی کبیر ← مُرّہ ہمدانی ← عبداللہ بن مسعود ﷺ۔

(۵) ابورَوق ← ضحاک ← عبداللہ بن مسعود ﷺ۔

ان میں سے پہلی، دوسری اور تیسری سندیں نہایت قوی ہیں اور خود امام بخاری ﷺ نے ان سندوں سے روایت لی ہے، روایت کا چوتھا سلسلہ مختلف فیہ ہے؛ کیوں کہ سدی کبیر کو بعض اہلِ علم نے معتبر مانا ہے اور بعض نے نہیں، پانچویں سند معتبر نہیں ہے؛ اس لئے کہ ضحاک کی عبداللہ بن مسعود ﷺ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔

حضرت علی ﷺ کی مرویات

سیدنا حضرت علی ﷺ کی طرف چوں کہ بہت سی روایتیں شیعہ رواۃ نے غلط طور پر منسوب کردی ہیں؛ اس لئے زیادہ تر مرویات محدثین کے نزدیک معتبر نہیں مانی گئی ہیں، عام طور پر ان سندوں کو قابلِ اعتبار سمجھا گیا ہے، جو اہلِ بیت کے ثقہ راویوں سے ہیں، یا حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کے شاگردوں کے سلسلہ سے مروی ہیں؛ چنانچہ حسبِ ذیل تین اَسناد حضرت علی ﷺ کی

تفسیری مرویات کے سلسلے میں معتبر مانی گئی ہیں :

(۱) ہشام ← محمد بن سیرین ← عبیدہ سلمانی ← علی ابن ابی طالب ؓ۔

(۲) ابن ابی حسین ← ابوطفیل ← علی ابن ابی طالب ؓ۔

(۳) ابن شہاب زہری ← علی زین العابدین ← حسین بن علی ← علی ابن ابی طالب ؓ۔

ان میں سے تیسری سند نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس کا شمار 'اصح الاسانید' یعنی صحیح ترین سندوں میں ہے، پہلی سند سے امام بخاری نے اپنی کتاب میں روایت نقل کی ہے اور دوسری سند بھی معتبر مانی گئی ہے۔

حضرت ابی بن کعب ﷺ کی مرویات

حضرت ابی بن کعب ﷺ کی تفسیری مرویات بھی مختلف سندوں سے منقول ہیں، جن میں بعض معتبر اور اکثر نامعتبر ہیں، معتبر سندیں دو ہیں :

(۱) ابوجعفر رازی ← ربیع ابن انس ← ابی بن کعب ؓ۔

(۲) وکیع ← سفیان ثوری ← عبداللہ بن محمد بن عقیل ← طفیل بن ابی بن کعب ← ابی بن کعب ؓ۔

دوسری سند میں عبد اللہ بن محمد پر بعض محدثین کو کلام ہے؛ لیکن امام احمدؒ اور مختلف محدثین نے ان کی روایت کو مستند مانا ہے۔

ان صحابہ ﷺ کے علاوہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر اور حضرت عبداللہ بن عمرو ﷺ سے بھی بعض آیات کی تفسیر نقل کی گئی ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) تفسیر کے لغوی معنی اور اس کی اصطلاحی تعریف پر روشنی ڈالیے؟

(۲) تفسیر اور تاویل میں کیا فرق ہے؟

(۳) تفسیر میں عہد صحابہ کی اہم شخصیتیں کون کون ہیں اور کن حضرات سے زیادہ تفسیری مرویات ہیں؟

(۴) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیری روایت میں معتبر سند کون کون ہے؟

(۵) علامہ فیروز آبادی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیری روایت کو کس نام سے جمع کیا ہے، ان کی مرویات کس سند سے ہیں اور وہ سندی اعتبار سے کس درجہ کی ہے؟

(۶) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیری مرویات کی کن اسناد کو امام بخاری نے قبول کیا ہے اور کن اسناد پر کلام کیا گیا ہے؟

(۷) حضرت علیؓ کی کن مرویات کو تفسیری روایات کے لیے معتبر مانا گیا ہے اور ان میں بھی سب سے اعلیٰ درجہ کی سند کونسی ہے؟

(۸) حضرت اُبی بن کعبؓ کی تفسیری مرویات کے سلسلے میں دو سندوں کو معتبر مانا گیا ہے، آپ انھیں ذکر کریں؟

تفسیر — عہد تابعین میں

صحابہ ﷺ کے بعد تابعین کا دور آتا ہے، اس دور میں بھی تدریس اور نقل وروایت کے ذریعہ علم تفسیر کی اشاعت عمل میں آئی، اس دور میں مکہ، مدینہ اور عراق تفسیر کے اہم مراکز تھے:

● مکہ میں امام مجاہدؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، سعید بن جبیرؒ، حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کے غلام عکرمہؒ اور طاوسؒ فن تفسیر کے امام سمجھے جاتے تھے، یہ سب حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کے خصوصی شاگردوں میں ہیں۔

● مدینہ کے علماء میں حضرت عمر ﷺ کے آزاد کردہ غلام زید بن اسلمؒ، ابوالعالیہؒ اور محمد بن کعب قرظیؒ نمایاں تھے، محمد بن کعب کو حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ سے اور ابوالعالیہ کو ان تینوں صحابہ کے علاوہ حضرت ابی بن کعب ﷺ سے بھی استفادہ کا موقع ملا تھا، اور زید بن اسلم نے اکابر صحابہ کو پایا تھا۔

● عراق کی درسگاہِ تفسیر کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے رکھی تھی اور یہاں کے ممتاز علماءِ تفسیر میں علقمہ بن قیس، مسروق بن اجدع، اسود بن یزید، مُرہ ہمدانی، عامر شعبی،

حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، عہد تابعین کے ان مفسرین کے اقوال کثرت سے کتب تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔

چند باتیں اس دور کو عہد صحابہ ﷺ سے ممتاز کرتی ہیں :

(۱) تابعین کے عہد میں مکی، مدنی اور عراقی مدارسِ تفسیر کی بنیاد پڑی، اہل مکہ عام طور پر حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کی آراء کو اختیار کرتے تھے، اہل مدینہ ابی بن کعب ﷺ کی، اور اہل عراق حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کی آراء کو ترجیح دیتے تھے۔

(۲) اس دور میں اسرائیلی روایات تفسیر میں بکثرت داخل ہوگئیں؛ کیوں کہ مختلف اہل کتاب علماء دامن اسلام میں آئے اور انھوں نے اپنی سابقہ معلومات کو بھی قرآن مجید کے بیان وتشریح کے لئے استعمال کیا۔

(۳) یوں تو صحابہ ﷺ کے درمیان بھی بعض آیات کی تشریح میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا؛ لیکن عہد تابعین میں اس طرح کا اختلاف نسبتاً بڑھ گیا۔

(۴) اسی عہد میں مختلف اعتقادی فرقے قدریہ اور جبریہ وغیرہ پیدا ہوئے، جن کے بعض عقائد اہل سنت والجماعت سے مختلف تھے۔

تیسرا عہد — تدوینی مراحل

تفسیر کا تیسرا عہد 'تبع تابعین' سے شروع ہوتا ہے، یہی عہد ہے جب اس فن کی تدوینی کوششوں کا آغاز ہوا اور یہ تدوین تین مراحل میں انجام پائی :

پہلا مرحلہ : محدثین نے احادیث کے مجموعوں میں احادیثِ تفسیر کا باب قائم کیا اور تفسیر قرآن کے ذیل میں رسول اللہ ﷺ کے جو ارشادات اور صحابہ وتابعین کے جو اقوال منقول تھے، انھیں جمع کر دیا، ان محدثین میں یزید بن ہارون سلمیؒ (متوفی : ۱۱۷ھ)، شعبہ بن حجاجؒ (متوفی : ۱۷۰ھ)، وکیع بن جراحؒ (متوفی : ۱۹۷ھ)، سفیان بن عیینہؒ (متوفی : ۱۹۸ھ) عبدالرزاق بن ہمامؒ (متوفی : ۲۱۱ھ)، وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اسی طریقہ کو بعد میں امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ وغیرہ نے بھی اختیار کیا۔

دوسرا مرحلہ : پورے قرآن مجید کی بالترتیب تفسیر کا تھا، اس سلسلہ میں ابن ماجہؒ (متوفی : ۲۷۳ھ)، ابن جریر طبریؒ (متوفی : ۳۱۰ھ)، ابوبکر بن منذر نیساپوریؒ (متوفی : ۳۵۸ھ)، ابن ابی حاتمؒ (متوفی : ۳۲۷ھ)، امام حاکمؒ (متوفی : ۴۰۵ھ)، وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے تفسیری روایات کو کتب حدیث کا جزء نہیں بنایا؛ بلکہ مستقل ایک فن کی حیثیت سے انھیں جمع کیا، گویا اس مرحلہ میں فن تفسیر نے فن حدیث سے الگ مستقل صورت اختیار کی؛ لیکن ان مجموعوں میں بھی تفسیری روایات کے نقل کرنے پر اکتفاء کیا گیا اور اس پر بحث ومناقشہ کی صورت عام طور پر اختیار نہیں کی گئی، اس سے ابن جریر طبریؒ کا استثناء ہے، جنھوں نے تفسیری اقوال نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دلائل بھی ذکر کئے، اقوال میں ایک کو دوسرے پر ترجیح بھی دی اور آیات سے احکام کا استنباط بھی کیا؛ چنانچہ ابن جریر طبری کو آئندہ آنے والے مفسرین کے لئے اساس وبنیاد ہونے کا اعزاز حاصل ہے، اور مفسرین کی ایک بڑی تعداد نے تفسیر میں اسی نہج کو اختیار کیا، جو طبری کا تھا؛ البتہ بعض نے تفسیری احادیث کو پوری سند کے ساتھ ذکر کرنے کے بجائے اختصار اور آسانی کے لئے اسناد حذف کردیں اور نقل اقوال پر اکتفاء کیا۔

تیسرا مرحلہ : وہ ہے جس میں 'تفسیر بالماثور' کے ساتھ ساتھ 'تفسیر عقلی' کو بھی شامل کیا گیا، یعنی صرف تفسیری احادیث اور صحابہ وتابعین کے تفسیری اقوال نقل کرنے کے بجائے اجتہاد واستنباط کے ذریعہ قرآن مجید سے اخذ کئے جانے والے احکام واشارات کو بھی تفسیر کا جزء بنادیا گیا، اس طرح فن تفسیر حدیث، لغت، قراءت، نحوی وصرفی ابحاث، معانی وبلاغت کے نکات، عقلی توجیہات، فقہی احکام، قصص وواقعات کے سلسلہ میں تاریخی شہادتوں وغیرہ کا ایک ایسا مجموعہ بن گیا، جس میں ہر جہت سے قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تفسیر قرآن کے مستقل فنی شکل میں مدون ہونے کے بعد کی سب سے پہلی کتاب جو آج ہمارے درمیان ہے، وہ 'تفسیر طبری' ہے، لیکن ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے بھی قرآن کی مکمل تفسیر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں جن چند شخصیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے نام اس طرح ہیں :

● سعید بن جُبیر (شہید: ۹۴/ ۹۵ھ)—ان کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے عبدالملک بن مروان (متوفی: ۸۶ھ) کی خواہش پر اس کے لیے تفسیر لکھی تھی۔

● ممتاز معتزلی عالم عمرو بن عُبید کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے حسن بصریؒ سے قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔

● ابن جُریج (متوفی: ۱۵۰ھ) کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے تین ضخیم جلدوں میں قرآن کی تفسیر تحریر کی تھی۔

● ابن ندیم نے 'کتاب الفہرست' میں نقل کیا ہے کہ "سب سے پہلی تفسیر فراء (متوفی: ۲۰۷ھ) نے لکھی ہے"—جس کی بعض جلدیں ماضی قریب میں شائع ہوچکی ہیں، اس طرح موجودہ کتابوں میں اسے تفسیر کی قدیم ترین کتاب کہا جاسکتا ہے، مگر ابھی یہ نامکمل ہے۔

معانی القرآن

غرض کہ اس وقت دنیا میں تفسیر کی جو پہلی کتاب مطبوعہ شکل میں موجود ہے، وہ شیخ ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فرّاء (متوفی: ۲۰۷ھ) کی ہے، یہ ۱۴۴ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، نحو میں ان کا بڑا بلند مقام مانا گیا ہے، مصنف نے متقدمین کے طریقہ کے مطابق اس تفسیر کو املاء کرایا تھا، ان املا نویسوں میں محمد بن جہم سَمَّری (متوفی: ۲۷۷ھ) بھی تھے، ان کا یہ نسخہ ماضی قریب تک مخطوطوں کی شکل میں تھا، اب یہ احمد یوسف نجاتی اور محمد علی نجار کی تحقیق کے ساتھ "معانی القرآن" کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوچکا ہے، اس میں قرآن مجید کی حرفاً حرفاً تفسیر کا التزام نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ مصنف نے اہم الفاظ اور آیات کی تشریح کی ہے، اس مختصر تفسیر میں نحوی وصرفی قواعد پر بھی توجہ دی گئی ہے، مصنف کے سن وفات سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ تفسیر دوسری صدی کے اواخر میں لکھی گئی ہوگی، پس، جیسے دوسری صدی کے اوائل میں فنی ترتیب کے ساتھ احادیث کا مرتب کیا ہوا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، اسی طرح اس صدی کے اواخر کا یہ تفسیری خزانہ بھی اُمت کے سامنے ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) تابعین کے عہد میں مکہ، مدینہ اور عراق تینوں مراکزِ تفسیر کے دو دو علماء کے نام قلم بند کریں۔

(۲) تفسیر میں تابعین کے عہد کی کونسی باتیں عہد صحابہ سے ممتاز کرتی ہیں؟

(۳) تفسیر کی فنی تدوین پر جو تین عہد گزرے ہیں ان پر مختصر نوٹ لکھئے؟

(۴) پہلی بار قرآن مجید کی مکمل تفسیر لکھنے کا شرف کن حضرات کو حاصل ہے؟

(۵) تفسیر کی پہلی کتاب جو دنیا میں اس وقت مطبوعہ شکل میں موجود ہے، اس کا نام کیا ہے؟ اس کے مؤلف اور املا نویس کون تھے اور کن اہل علم کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی؟

مختلف منہج پر کتبِ تفسیر کی تالیف

قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے، اب قیامت تک دوسری کتاب نازل نہیں ہوسکتی؛ اس لئے اس کتاب کی خدمت سے بڑھ کر کوئی اور سعادت نہیں ہوسکتی، قرآن کی خدمت کی بنیادی طور پر دو اہم جہتیں ہیں، ایک کا تعلق الفاظِ قرآن سے ہے اور دوسرے کا تعلق معانی قرآن سے، مفسرین نے اسی دوسرے پہلو کو لیا ہے اور قرآن مجید کے معانی ومطالب کی تشریح ووضاحت کی ہے، تشریح ووضاحت میں مختلف اہل علم نے اپنے ذوق اور علمی اختصاص کے اعتبار سے قرآن کی خدمت کی ہے، جیسے کسی نے نحو وصرف اور لغت کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، کسی نے معانی وبلاغت کے پہلو کو، کسی نے احکامِ شرعیہ کے استنباط پر توجہ دی ہے اور کسی نے تصوف کے حقائق اخذ کرنے کی کوشش کی ہے؛ لیکن بنیادی طور پر تفسیر میں دو منہج اختیار کئے گئے ہیں: تفسیر بالماثور اور تفسیر بالمعقول۔

تفسیر بالماثور سے مراد ہے: قرآن، حدیث، آثار صحابہ اور تابعین کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کی تشریح۔

تفسیر بالمعقول سے مراد ہے: نصوص کے ساتھ ساتھ اجتہاد و استنباط، لغت و معانی اور دوسرے ذرائع سے بھی استفادہ کرتے ہوئے قرآن کے معانی و مطالب متعین کرنا، اس کو ''تفسیر بالرائ'' بھی کہتے ہیں ـــــ ایک رائے وہ ہے جو قرآن و حدیث میں اجتہاد اور صحیح استنباط کرکے قائم کی جائے، جیسے فقہاء و متکلمین کرتے ہیں، یہ رائے محمود اور قابل تحسین ہے، دوسری رائے وہ ہے جس میں اپنی خواہش اور تعصب یا جہالت کا دخل ہو، جیسا کہ فرقِ باطلہ نے کی ہے، حدیث میں جو تفسیر بالرائ کی ممانعت کی گئی ہے، اس سے یہی دوسری قسم کی رائے مراد ہے؛ اس لئے ''تفسیر بالمعقول'' تفسیر بالرائے کے زمرہ میں شامل نہیں ہے۔

تفسیر بالماثور

تفسیر بالماثور کے منہج پر جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، اس سلسلہ کی سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب ''جامع البیان فی تاویل اٰی القرآن'' ہے، جو تفسیر طبری کے نام سے معروف ہے، یہ مشہور محدث و فقیہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (۳۱۰-۲۲۰ھ) کی تالیف ہے، جو طبرستان کے رہنے والے تھے، یہ روایات اپنی سند سے نقل کرتے ہیں، عام طور پر ان کی روایات معتبر مانی گئی ہیں؛ البتہ انھوں نے کعب احبار اور وہب بن منبہ کے حوالہ سے بہت سی اسرائیلی روایات بھی نقل کردی ہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب ابوالفداء اسماعیل ابن کثیر دمشقی شافعی (متوفی: ۷۷۴ھ) کی ''تفسیر القرآن العظیم'' ہے، جو تفسیر ابن کثیرؒ کے نام سے معروف ہے، اس کتاب میں کتب احادیث کے حوالہ سے کثرت سے تفسیری روایات نقل کی گئی ہیں، بہت سے مقامات پر معتبر اور نامعتبر ہونے کے اعتبار سے حدیث کا درجہ بھی بیان کیا گیا ہے؛ لیکن ہر جگہ اس کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے، اسرائیلی روایات نقل کرتے ہوئے بے اصل اور خلافِ عقل باتوں پر تنقید بھی کی گئی ہیں، تفسیر طبری کے مقابلہ اس میں ضعیف روایتیں کم ہیں اور مختصر ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اہل علم کے درمیان اس کو پذیرائی حاصل رہی ہے۔

تفسیر بالماثور کی تیسری اہم کتاب ''**الدر المنثور فی التفسیر بالماثور**'' ہے،

جو مشہور مؤلف علامہ جلال الدین بن عبد الرحمن بن ابو بکر سیوطی شافعی (متوفی: ۹۱۱ھ) کی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں دس ہزار سے زیادہ احادیث وآثار نقل کئے گئے ہیں؛ البتہ اس میں ضعیف روایتیں بھی بکثرت ہیں اور مؤلف نے احادیث کا درجہ ذکر کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔

ان کے علاوہ تفسیر بالماثور کی کچھ اہم کتابیں یہ ہیں :

- بحر العلوم (المعروف بہ: تفسیر سمرقندی)، تالیف: نصر بن محمد سمرقندی (م: ۳۷۳ھ)۔
- الکشف والبیان (المعروف بہ: تفسیر الثعلبی)، تالیف: احمد بن ابراہیم (م: ۴۲۷ھ)۔
- معالم التنزیل (المعروف بہ: تفسیر البغوی)، تالیف: الحسین بن مسعود (م: ۵۱۰ھ)۔
- المحرر الوجیز تفسیر الکتاب العزیز (المعروف بہ: تفسیر ابن عطیہ)، تالیف: عبد الحق بن غالب الاندلسی (م: ۵۴۶ھ)۔
- الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن (المعروف بہ: تفسیر الجواہر)، تالیف: عبد الرحمن بن محمد الثعلبی (م: ۸۷۶ھ)۔

تفسیر بالمعقول

تفسیر بالمعقول کے پہلو سے غالباً سب سے اہم کتاب ''مفاتیح الغیب'' (تالیف: ابو عبد اللہ محمد ابن عمر فخر الدین الرازی الشافعی، م: ۶۰۶ھ) ہے، یہ تفسیر اپنی ضخامت اور تفصیل کی وجہ سے ''تفسیر کبیر'' کے نام سے معروف ہے، علامہ رازی نے احادیث وآثار کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ علم کلام، فقہ وقراءت، نحو وصرف، بلاغت اور حکمت وفلسفہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور فرق باطلہ کے رد پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے؛ اگرچہ بعض ناقدین نے کہہ دیا ہے کہ اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے: **''کل شئ فیہ إلا التفسیر''** لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تنقید مبنی بر انصاف نہیں ہے؛ بلکہ یہ روایت ودرایت کو جامع نہایت اہم تفسیر ہے؛ البتہ بعض مقامات پر فلسفہ کے مضامین کو ضرورت سے زیادہ شرح وبسط سے پیش کیا گیا ہے۔

تفسیر بالمعقول کی ایک مقبول کتاب علامہ ابوالبرکات عبد اللہ بن احمد محمود نسفی حنفی (م: ۷۰۱ھ) کی ''مدارک التنزیل وحقائق التاویل'' ہے، جو 'تفسیر مدارک' کے نام سے معروف ہے، انھوں نے 'تفسیر کشاف' سے زیادہ استفادہ کیا ہے، اس تفسیر میں مؤلف نے اختصار کو ملحوظ رکھا ہے، عربی قواعد کی بحثوں کو اہتمام سے نقل کیا ہے، جس سے عبارت فہمی میں بڑی مدد ملتی ہے، قراءت سبعہ کو بھی نقل کرتے ہیں، احکام فقہیہ پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں اور فقہاء کے اختلاف اور دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہیں، اسرائیلیات بہت کم نقل کرتے ہیں، اگر اس میں کوئی بات اسلام کے مزاج کے خلاف ہے تو اس پر نقد بھی کرتے ہیں۔

تفسیر بالمعقول میں تیرہویں صدی کی ایک اہم کتاب علامہ ابوالفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی (۱۲۱۷-۱۲۷۰ھ) کی تفسیر ''روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی'' ہے، یہ تفسیر پہلی تفسیروں کا نچوڑ اور بعد کی تفسیروں کا ماخذ ہے، مصنف نے تفسیر ابن عطیہ، البحر المحیط، کشاف، تفسیر ابی السعود، بیضاوی اور تفسیر کبیر سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے، بہت سی جگہ ان کی آراء نقل کر کے ان پر تنقید بھی کرتے ہیں، مصنف نے اعتقادی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے، وہ اہل سنت والجماعت کے مسلک کے زبردست ترجمان اور معتزلہ اور روافض وغیرہ کے ناقد ہیں، اگر چہ مسلکاً شافعی ہیں؛ لیکن فقہی مسائل میں ان کا رجحان حنفیہ اور شوافع دونوں کی طرف ہوتا ہے، مگر بعض مسائل میں ان کی رائے دونوں سے مختلف بھی ہوتی ہے، اس تفسیر میں نحوی قواعد کی بحثوں پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے اور کائناتی حقائق کو بھی مصنف نے جا بجا تفصیل سے پیش کیا ہے، اسرائیلیات کے بارے میں مصنف کا رویہ محتاط ہے اور بعض مفسرین نے جو اسرائیلیات نقل کی ہیں، ان کو نقل کر کے ان پر تنقید بھی کی ہے، مصنف نے ''من باب الاشارات'' کے عنوان سے آیاتِ قرآنی پر صوفیاء کی واردات کو بھی نقل کیا ہے۔

ان کے علاوہ تفسیر بالمعقول کی چند اہم کتابیں یہ ہیں:

- انوار التنزیل واسرار التاویل (المعروف بہ: تفسیر البیضاوی)، تالیف: عبد اللہ بن عمر البیضاوی (م: ۶۸۵ھ)۔

● لباب التاویل فی معانی التنزیل (المعروف بہ: تفسیر الخازن)، تالیف: عبداللہ بن محمد المعروف بالخازن (م: ۷۴۱ھ)۔

● البحر المحیط (المعروف بہ: تفسیر النیسابوری)، تالیف: محمد بن یوسف بن حیان الاندلسی (م: ۷۴۵ھ)۔

● تفسیر الجلالین (المعروف بہ: تفسیر الجلالین)، تالیف: جلال الدین محلی (م: ۸۶۴ھ)، جلال الدین السیوطی (م: ۹۱۱ھ)۔

● غرائب القرآن ورغائب الفرقان (المعروف بہ: تفسیر النیسابوری)، تالیف: نظام الدین الحسن محمد النیسابوری (م: ۷۲۸ھ)۔

● ارشاد العقل السلیم (المعروف بہ: تفسیر ابی السعود)، تالیف: محمد بن محمد مصطفی طحاوی حنفی (م: ۹۵۲ھ)۔

● السراج المنیر (المعروف بہ: تفسیر الخطیب)، تالیف: محمد الشربینی الخطیب (م: ۹۷۷ھ)۔

فقہی منہج پر

قرآن مجید کا ایک اہم مضمون زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق احکام کی رہنمائی ہے؛ چنانچہ بعض اہل علم نے قرآن کی تفسیر میں خاص طور پر اس پہلو پر زور دیا ہے اور فقہی منہج پر تفسیر لکھی ہے، ایسی کتابوں میں بعض وہ ہیں، جن میں پورے قرآن مجید کی تفسیر کی گئی ہے؛ لیکن احکام فقہیہ کے اخذ واستنباط پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، اس لحاظ سے دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

تفسیر قرطبی

فقہی منہج پر پورے قرآن مجید کی سب سے اہم تفسیر علامہ ابوعبداللہ محمد قرطبیؒ مالکی (م: ۶۷۱ھ) کی تفسیر "**الجامع لأحکام القرآن والمبین لما تضمنه من السنة وآی الفرقان**" ہے، مصنف کی نسبت سے اسے "تفسیر قرطبی" بھی کہا جاتا ہے، یہ تفسیر اپنی جامعیت،

وضاحتِ بیان اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے عربی کی چند منتخب تفسیروں میں سے ایک ہے؛ اسی لئے بعد کے مفسرین نے کثرت سے اس سے استفادہ کیا ہے، کتاب کے شروع میں مصنف کا تفصیلی مقدمہ ہے۔

مصنف کا منہج یہ ہے کہ وہ اپنی تمام بحثوں کو ابتداء میں ہی تقسیم کر دیتے ہیں، مثلاً: ''بسم اللہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں ۲۷ بحثیں ہیں، پھر نمبر وار اُن مباحث کو ذکر کرتے ہیں، صرفی، ادبی، فقہی اور اعتقادی، نیز لغوی بحثیں الگ الگ ذکر کی جاتی ہیں، احادیث و آثار کے ساتھ ساتھ مصنف نے عربی زبان کے قواعد، فصاحت و بلاغت کے اُصول، شعراء کے کلام سے استفادہ اور فقہاء کے استنباط و اجتہاد کے تذکرہ کا التزام کیا ہے، دوسرے اہل علم کی آراء نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ترجیح دیتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں اور فقہی مباحث — خواہ صراحتاً مذکور ہوں یا قرآنی اشارات سے اخذ کئے جاسکتے ہوں — پر مؤلف کی خصوصی توجہ ہوتی ہے، وہ فقہی اعتبار سے مالکی ہیں؛ لیکن تمام فقہاء کی آراء اور دلائل کو انصاف سے نقل کرتے ہیں اور بعض دفعہ دوسرے مکاتب فقہ کی آراء کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔

تفسیر مظہری

یہ ہندوستان کے مشہور بزرگ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے خلیفۂ خاص قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (متوفی: ۱۲۲۵ھ) کے قلم سے ہے، یہ تفسیر یوں تو ہر پہلو سے گرانقدر معلومات کا ذخیرہ ہے؛ لیکن فقہی احکام پر مصنف نے خصوصی توجہ دی ہے، جو آٹھ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے؛ حالاں کہ یہ تفسیر اپنی جامعیت اور فقہی مباحث کے احاطہ کے اعتبار سے ایک ممتاز تفسیر ہے، مگر عالم عرب میں ابھی اس کا کما حقہ تعارف نہیں ہو پایا ہے، اس کا اُردو ترجمہ بھی متعدد جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ کتابیں وہ ہیں، جن میں صرف آیاتِ احکام ہی کی تفسیر کی گئی ہے، تقریباً ہر دبستانِ فقہ میں اس پہلو سے قرآن مجید کی خدمت کی گئی ہے؛ لیکن اس سلسلہ کی چند اہم کتابیں یہ ہیں:

(۱) احکام القرآن (المعروف بہ: تفسیر جصاص) تالیف: احمد علی رازی جصاص (م: ۳۷۰ھ)۔

(۲) احکام القرآن (المعروف بہ: تفسیر الکیاالہراسی)، تالیف: علی بن محمد الطبری الکیاالہراسی (م: ۵۰۴)۔

(۳) الاکلیل فی استنباط التنزیل (المعروف بہ: تفسیر السیوطی)، تالیف: جلال الدین السیوطی (م: ۹۱۱ھ)۔

(۴) احکام القرآن (المعروف بہ: تفسیر ابن العربی) تالیف: محمد عبداللہ الاندلسی (م: ۵۴۳ھ)۔

(۵) الجامع لأحکام القرآن (المعروف بہ: تفسیر القرطبی)، تالیف: محمد بن احمد بن فرح القرطبی (م: ۶۷۱ھ)۔

(۶) تفسیرات احمدیہ، تالیف: ملا محمد جیون (م: ۱۱۴۰ھ)۔

(۷) نیل المرام، تالیف: نواب صدیق حسن خان (م: ۱۳۰۷ھ)۔

ادبی پہلو پر

قرآن مجید کا ایک امتیازی پہلو زبان و بیان کے اعتبار سے اس کا فصاحت و بلاغت کے اوجِ کمال پر ہونا ہے؛ بلکہ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے اور اس لئے جو اہل مکہ قرآن مجید کو انسانی کلام قرار دیتے تھے، قرآن نے انھیں اس کی نظیر پیش کرنے کا چیلنج کیا ہے، جو آج تک موجود ہے؛ اس لئے قرآن مجید کی بلاغت اور لسانی اعتبار سے اس کے محاسن مفسرین کا خاص موضوع رہا ہے اور مختلف مفسرین نے اس کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں تفسیر کی جس کتاب کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے، وہ علامہ ابوالقاسم جاراللہ محمود زمخشری خوارزمی (۵۳۸-۴۶۷ھ) کی تفسیر ''کشاف'' ہے، اس تفسیر کا پورا نام ''الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل'' ہے، علامہ زمخشری کے بعد جن اہل علم نے تفسیر کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، انھوں نے عموماً کشاف سے استفادہ کیا ہے اور اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے ادبی محاسن کو سمجھنے میں کشاف سے استفادہ کے بغیر چارہ

نہیں ہے؛ البتہ مصنف فکری اعتبار سے معتزلی ہیں؛ چنانچہ انھوں نے کشاف میں ان افکار کی بھرپور ترجمانی کی ہے، اس لئے کشاف کے مطبوعہ نسخوں پر دو حاشیے بھی شائع کئے گئے ہیں، ایک سید شریف علی جرجانی کا، دوسرا علامہ ناصر الدین احمد اسکندری مالکی کا، جس کا نام ہے ''الانصاف فی ما تضمنہ الکشاف من الاعتزال'' یہ دوسرا رسالہ ــــ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ــــ علامہ زمخشری کے معتزلانہ افکار کی تردید اور اہل سنت والجماعت کی تائید و ترجمانی میں ہے۔

فرقِ باطلہ کی تفسیریں

قرآن مجید چوں کہ احکام شرعیہ کی اساس و بنیاد ہے اور ادلہ شرعیہ میں اول درجہ پر ہے، اس لئے مختلف اعتقادی مکاتب فکر نے قرآن مجید کی تفسیریں مرتب کی ہیں، جن میں اہل سنت کے علاوہ، اہل تشیع اور معتزلہ کی بہت سی کتابیں ہیں۔

معتزلہ میں یوں تو مختلف مفسرین کا ذکر ملتا ہے، جن میں ابو ہاشم عبدالسلام جبائی (متوفی: ۳۲۱ھ)، ابومسلم اصفہانی (متوفی: ۳۲۲ھ) وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، لیکن اس حلقہ کی دو کتابیں اہم سمجھی گئی ہیں:

(۱) تنزیہ القرآن عن المطاعن: یہ قاضی عبدالجبار ہمدانی شافعی (متوفی: ۴۱۵ھ) کی تفسیر ہے، جس میں عربی زبان اور معتزلی عقائد کے نقطۂ نظر سے ہونے والے اشکالات کو حل کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

(۲) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل: یہ علامہ زمخشری حنفی (۴۶۷ھ-۵۳۸ھ) کی مشہور تفسیر ہے، جس کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے، جہاں زبان وادب کے پہلو سے یہ ایک بے مثال تفسیر ہے، وہیں اس کتاب میں علامہ زمخشری فکر اعتزال کے زبردست وکیل و ترجمان اور اہل السنت والجماعت کی فکر کے زبردست ناقد نظر آتے ہیں۔

اہل تشیع اور خاص کر فرقۂ اثنا عشریہ کے یہاں بھی فن تفسیر پر بڑی توجہ رہی ہے، اس فرقہ کی بعض اہم کتبِ تفسیر اور ان کے مصنفین کے نام ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) تفسیر الحسن العسکری: امام حسن عسکری (۲۳۱ھ-۲۶۰ھ)۔

(۲) مجمع البیان لعلوم القرآن: ابوعلی فضل بن حسین طبرسی (متوفی: ۵۳۸ھ)۔

(۳) الصافی فی تفسیر القرآن الکریم: ملا محسن کاشی (یہ گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں ہیں)۔

(۴) بیان السعادۃ فی مقامات العبادۃ: سلطان بن محمد خراسانی (یہ چودہویں صدی ہجری کے علماء میں ہیں)۔

تمرینی سوالات

(۱) تفسیر بالماثور سے کیا مراد ہے اور اس منہج کی اہم کتابیں کیا ہیں؟

(۲) تفسیر بالمعقول سے کیا مراد ہے اور اس نہج کی اہم کتابیں کیا ہیں، نیز مصنفین کے نام بھی لکھیے؟

(۳) فقہی منہج پر لکھی گئی دو کتابوں کا تعارف آپ نے اس سبق میں پڑھا، ان دونوں کے نام اور ان کے مصنف کے نام تحریر کیجیے۔

(۴) ادبی نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی کس تفسیر کو امتیازی حیثیت حاصل ہے؟

(۵) معتزلہ اور اہل تشیع کی کم از کم تین تفسیروں کے نام مع مصنف بتایئے؟

● ● ●

تفسیر کے ماٰخذ

قرآن مجید کے مقصد و معنی کو سمجھنے کے لئے جن ذرائع سے رُجوع کیا جاتا ہے، وہ چھ ہیں :

(۱) قرآن مجید۔ (۲) حدیث۔

(۳) آثارِ صحابہ۔ (۴) لغت۔

(۵) رائے۔ (۶) گذشتہ آسمانی کتابیں۔

قرآن مجید سے تفسیر

ان میں سب سے اہم اور معتبر ذریعہ خود قرآن مجید ہے، قرآن مجید کی ایک آیت سے دوسری آیت کی تفسیر کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے اہم کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

(الف) مجمل کا بیان، یعنی قرآن مجید کی ایک آیت میں کوئی حکم اجمال و ابہام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو، دوسری آیت سے اس کے مقصد و مراد کی وضاحت ہوتی ہو۔

● اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِن رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ۔ (البقرۃ:۳۷)

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ الفاظ سیکھ لئے۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا :

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنفُسَنَا وَاِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۔ (الاعراف:۲۳)

اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو یقیناً ہم بڑے گھاٹے میں آجائیں گے۔

اس دوسری آیت نے واضح کردیا کہ ''کلمات'' سے یہی دُعائیہ کلمات مراد ہیں :

• اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ ، صِرَاطَ الَّذِینَ أَنعَمتَ عَلَیھِمْ ۔ (الفاتحۃ:٦)

ہمیں سیدھا راستہ دکھائیے ، ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا۔

''الَّذِینَ أَنعَمتَ عَلَیھِمْ'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ —''نساء: ٦٩'' اس کو واضح کرتی ہے :

وَمَن یُطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِینَ أَنعَمَ اللّٰہُ عَلَیھِم مِّنَ النَّبِیِّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاء وَالصَّالِحِینَ وَحَسُنَ أُولٰٓئِکَ رَفِیقاً ۔ (النساء:٦٩)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا، جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، یعنی پیغمبر، صدیق، شہداء اور صالح، کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت!

معلوم ہوا کہ اس سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین مراد ہیں۔

(ب) کبھی ایک لفظ اپنے معنی کے اعتبار سے مشترک ہوتا ہے، دوسری آیت سے اس کا معنی متعین ہوتا ہے، مثلاً :

وَلْیَطَّوَّفُوا بِالْبَیْتِ الْعَتِیقِ ۔ (الحج:٢٩)

اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

''پرانا گھر'' کوئی اور بھی ہوسکتا ہے، — دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ اس سے مکہ مکرمہ میں تعمیر ہونے والا کعبۃ اللہ مراد ہے :

إِنَّ أَوَّلَ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِی بِبَکَّۃَ مُبَارَکاً ۔ (۱)

(۱) آل عمران:٩٦۔

بے شک پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے بنایا گیا،

وہی ہے جو مکہ میں ہے، وہ بابرکت بھی ہے۔

(ج) کبھی کسی گروہ کا ایک آیت میں مبہم طور پر ذکر کیا جاتا ہے، دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ اس سے کونسی قوم مراد ہے؟

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ، وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ، وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ، كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۔ (الدخان:۲۵-۲۸)

کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے، کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے، ان کے پیچھے دھرے رہ گئے، یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔

کونسا گروہ ہے جو باغات اور چشموں سے محروم ہوگیا اور کونسی قوم ہے جس نے اس کی جگہ لی؟ — یہاں اس کی صراحت نہیں ہے؛ لیکن ایک دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ پہلی قوم سے قوم فرعون مراد ہے، جس کو حضرت موسیٰ ﷺ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور جس قوم نے ان کی جگہ لی، وہ قوم بنی اسرائیل ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے:

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ، وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ، كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ، فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۔ (شعراء:۵۷-۶۰)

اس طرح ہم انھیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہ سے نکال لائے، یہ تو ہوا ان کے ساتھ، اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ان سب چیزوں کا وارث کر دیا، صبح ہوتے ہوئے یہ لوگ ان کے تعاقب میں چل پڑے۔

(د) کبھی ایک آیت میں کوئی بات اطلاق کے ساتھ کہی جاتی ہے، دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ یہ حکم مطلق نہیں ہے؛ بلکہ قید کے ساتھ ہے، مثلاً :

وَمَن يَكْفُرْ بِالإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ ۔ (المائدۃ:۵)

اور جو ایمان لانے سے انکار کرے، اس کا عمل اکارت ہوجائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ارتداد مطلقاً ''حبطِ عمل'' کا باعث ہے؛ لیکن دوسری جگہ وضاحت فرمائی گئی کہ یہ حکم اس صورت میں ہے، جب کہ اس کو توبہ کی توفیق نہ ہو اور حالت کفر ہی میں اس کی موت ہوجائے۔

وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۔ (البقرۃ:۲۱۷)

اور (یادرکھو کہ) تم میں سے جو شخص دین سے مرتد ہوجائے اور کفر کی حالت میں مرے تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے (نیک) عمل غارت ہوجائیں گے۔

(ہ) کبھی ایک آیت میں حکم عام ہوتا ہے اور دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ حکم خاص ہے، مثال کے طور پر :

● فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۔ (النساء:۳)

تو جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو، دو دو، تین تین، چار چار۔

بہ ظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی عورت پسند ہو، چار کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے نکاح کرنا حلال ہے؛ لیکن قرآن مجید کی دوسری آیت محرم عورتوں کی تخصیص کرتی ہے کہ ان سے نکاح کرنا حرام ہے :

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ ... الخ ۔ (۱)

(۱) النساء:۲۳۔

تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں حرام کی گئیں ہیں۔

● حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ ... الخ۔ (المائدۃ:۳)

تم پر مردار، خون اور سور کا گوشت حرام قرار دیا گیا ہے۔

دوسری جگہ حرام چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے:

أَوْ دَماً مَّسْفُوْحاً۔ (الانعام:۱۴۵)

معلوم ہوا کہ ''دم'' سے ''دمِ مسفوح'' یعنی بہتا ہوا خون مراد ہے، جو رگوں میں ہوتا ہے، نہ کہ وہ خون جو گوشت میں ہوتا ہے۔

(و) کبھی ایک جگہ نسبتاً غیر معروف لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ زیادہ معروف لفظ؛ تاکہ پہلے لفظ کی وضاحت ہو جائے، مثال:

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيْلٍ۔ (الحجر:۷۴)

اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر برسا دیئے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِيْنٍ۔ (الذاریات:۳۳)

تاکہ ان پر پکی مٹی کے پتھر برسا دیں۔

معلوم ہوا کہ ''سجیل'' سے مراد ''طین'' (مٹی) کی کنکری ہے۔

(ز) کبھی ایک جگہ کسی واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیلی کیفیت بیان کی جاتی ہے، جیسے:

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوْسٰى أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهٖ۔ (البقرۃ:۵۱)

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ لیا، پھر موسیٰ کے (جانے کے) بعد تم نے (پوجا کرنے کے لئے) بچھڑا بنالیا۔

دوسری جگہ چالیس راتوں کی تفصیل ذکر کی گئی ہے :

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۔ (الاعراف:۱۴۲)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اسے دس راتوں سے رب کی مقرر کی ہوئی مدت چالیس راتیں پوری ہوگئیں۔

واقعات وقصص کے ذکر میں بیشتر مقامات پر قرآن مجید میں یہی اُسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

(ح) کبھی ایک آیت میں ''وقت'' کے ذکر کے بغیر کسی مضمون کو بتایا جاتا ہے اور دوسری آیت سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق کس زمانہ سے ہے، یا دنیا سے ہے یا آخرت سے؟ مثلاً :

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ (البقرۃ:۱۴۳)

تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق قیامت کے دن سے ہے :

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۔ (النساء:۴۱)

پھر جب ہم ہر اُمت میں سے گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے لائیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا؟

حدیثِ نبوی سے تفسیر

قرآن مجید کے بعد دین وشریعت کو جاننے اور سمجھنے کا سب سے اہم اور سب سے مستند ذریعہ ''حدیث'' ہے؛ اسی لئے قرآن مجید کی تفسیر وتشریح میں بھی حدیث کو بڑی اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ صرف قرآن مجید کو پہنچادینا آپ ﷺ کی ذمہ داری نہیں تھی؛ بلکہ اس کی تشریح وتوضیح بھی آپ ﷺ کے ذمہ تھی :

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ۔ (۱)

اور ہم نے آپ پر بھی نصیحت نامہ اُتارا ہے؛ تا کہ آپ لوگوں پر ظاہر کردیں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا اور تا کہ وہ غور کریں۔

حدیث کے ذریعہ مختلف جہتوں سے قرآن مجید کی تفسیر ووضاحت ہوتی ہے۔

(الف) بعض دفعہ آپ ﷺ نے ایک آیت سے دوسری آیت کی تفسیر فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ ۔ (۲)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کی آمیزش سے محفوظ رکھا۔

تو ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے آپ پر ظلم نہ کیا ہو؟ — آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہاں ظلم سے "شرک" مراد ہے، جیسا کہ لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا:

يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۔ (۳)

اے میرے بیٹے! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

● حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "**تلقی عیسیٰ محبته ولقاه الله**"(۴) میں "لقاہ" سے مراد ہے:

سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۔ (۵)

تو پاک ہے، میرا یہ کام نہ تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔

---

(۱) النحل:۴۴۔ (۲) الانعام:۸۲۔ (۳) لقمان:۱۳۔

(۴) بخاری، کتاب التفسیر، باب ولم یلبسو الایمانہم بظلم، حدیث نمبر: ۴۶۲۹۔

(۵) المائدۃ:۱۱۶، ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ المائدۃ، حدیث نمبر: ۳۰۶۲۔

(ب) کبھی آپ ﷺ نے اپنے الفاظ میں کسی آیت کی تفسیر فرمادی۔

(۱) خواہ پہلے تفسیر ذکر کردی ہو، پھر آیت تلاوت فرمائی ہو، جیسے :

● حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو طلب کیا جائے گا، وہ کہیں گے: لبیک وسعدیک اے میرے پروردگار! پھر اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے: کیا تم نے میرا پیغام پہنچادیا؟ وہ کہیں گے: جی ہاں، اللہ تعالیٰ ان کی اُمت سے دریافت فرمائیں گے: کیا نوح نے تم کو میرا پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: میرے پاس تو کوئی ڈرانے والا آیا نہیں، اللہ تعالیٰ حضرت سے نوح علیہ السلام سے پوچھیں گے: تمہارا گواہ کون ہے؟ چنانچہ اُمت محمد یہ گواہی دے گی کہ حضرت نوح علیہ السلام آپ کا پیغام پہنچا چکے ہیں اور رسول اللہ ﷺ تم لوگوں پر گواہی دیں گے، یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی :

وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (البقرۃ:۱۴۳)

اور رسول تم پر گواہ ہوں گے۔(۱)

(۲) یا پہلے آیت ذکر فرمائی ہو، پھر اس کی تشریح کی ہو، جیسے :

● حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ ﷺ نے اپنے خطبہ میں ''ناقہ'' (حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی) اور اس کے مارڈالنے والے کا ذکر فرمایا اور یہ آیت پڑھی: ''إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا'' (الشمس:۱۲) پھر فرمایا: یہ حرکت عزیز عارم نامی شخص نے کی، جو ابوزمعہ کی طرح اپنی قوم میں بڑا با اثر واقع ہوا تھا۔(۲)

● حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا :

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ۔ (الانفال:۶۰)

— پھر فرمایا: یاد رکھو! قوت سے مراد تیر اندازی ہے، قوت سے مراد تیر اندازی ہے، قوت سے مراد تیر اندازی ہے۔(۳)

---

(۱) بخاری کتاب التفسیر، سورہ بقرہ، حدیث نمبر: ۴۲۱۷۔

(۲) بخاری، کتاب التفسیر تفسیر سورۃ والشمس وضحاہا، حدیث نمبر: ۴۹۴۲۔

(۳) مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی الخ، حدیث نمبر: ۱۹۱۷۔

(ج) کبھی ایسا ہوا کہ صحابہ کو کسی آیت کو سمجھنے میں دشواری پیش آئی، رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی، جیسے :

● حضرت عدی بن حاتم ﷺ نے "**حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ**" (البقرة:۱۸۷) کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ سفید اور سیاہ دھاگہ سے کیا مراد ہے، کیا یہ دو دھاگے ہیں؟ آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی: سیاہ دھاگہ سے رات کی سیاہی مراد ہے اور سفید دھاگہ سے دن کی سفیدی۔(۱)

● حضرت عائشہ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**لیس أحد یحاسب إلا هلک**" (جس کا بھی حساب لیا جائے گا، وہ ضرور ہی ہلاک ہوگا) میں نے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں ہے :

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ، فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَاباً یَّسِیْراً۔ (الانشقاق:۷-۸)

آپ ﷺ نے فرمایا: اس آیت میں حساب سے مراد صرف حساب کا پیش کرنا ہے، جس سے حساب کی بابت سوال وجواب ہوگا اور مناقشہ ہوگا، وہ تو ہلاک ہو کر ہی رہے گا۔(۲)

(د) کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے قرآن مجید کے کسی لفظ کے بارے میں سوال کیا، پھر خود اس کی وضاحت فرمائی، مثلاً :

جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے صحابہ سے دریافت فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ کوثر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو معلوم ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ایک نہر ہے، جس کا میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے، یہ ایک حوض ہے، جس پر قیامت کے دن میری اُمت آئے گی، اس کے برتن ستاروں کے برابر ہیں، (۳) —— اس ارشاد سے کوثر کی تفسیر معلوم ہوگئی۔

---

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، باب وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود، حدیث نمبر: ۴۵۱۰۔

(۲) بخاری، کتاب التفسیر، باب سوف یحاسب حسابا یسیرا، حدیث نمبر: ۴۹۳۹۔

(۳) مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجۃ من قال البسملۃ آیۃ من کل سورۃ الخ، حدیث نمبر: ۴۰۰۔

(ہ) بعض اوقات قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی خاص لفظ کی آپ نے صراحت کے ساتھ تفسیر نہیں فرمائی؛ لیکن اس کے ذریعہ قرآن کے کسی لفظ یا فقرہ کی تفسیر سمجھی جاسکتی ہے :

● اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ۔ (البقرۃ:۲۳۸)

تمام نمازوں اور (خاص کر) درمیانی نماز کی پابندی کرو اور اللہ کے سامنے خاموش کھڑے ہوا کرو۔

— اس آیت میں ''صلوٰۃ وسطیٰ'' (درمیانی نماز) سے کونسی نماز مراد ہے؟ اس کی وضاحت آپ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے، جو آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے دن فرمایا کہ ان لوگوں نے ہمیں ''صلوٰۃ وسطیٰ'' سے روک دیا، یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا، (۱) اس سے وضاحت ہوگئی کہ ''صلوٰۃ وسطیٰ'' سے نماز عصر مراد ہے؛ کیوں کہ اسی کا وقت سورج غروب ہونے سے پہلے ہے۔

● حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے مس کرتا ہے اور اس کی وجہ سے بچہ چیختا ہے، سوائے حضرت مریم ؑ اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ ؑ کے، حضرت ابوہریرہ ؓ نے فرمایا کہ چاہو تو یہ آیت پڑھ لو :

وَاِنِّيْ أُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۔ (۲)

میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔

● حضرت عدی بن حاتم ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہود مغضوب علیہم ہیں اور نصاریٰ گمراہ ہیں، (۳) — آپ ﷺ کا یہ ارشاد ''**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ**'' کی تفسیر ہوسکتا ہے۔

---

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، باب حافظوا علی الصلوات والصلاۃ الوسطیٰ، حدیث نمبر: ۴۵۳۳۔

(۲) آل عمران: ۳۶۔

(۳) ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ الفاتحہ، حدیث نمبر: ۲۹۵۳۔

(و) کبھی صحابہ کے درمیان کسی آیت کے مفہوم کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوا، آپ ﷺ نے وضاحت فرمادی، اس طرح اختلاف بھی دور ہوگیا اور آیت کی تشریح بھی ہوگئی، جیسے: "لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى" (التوبۃ:۱۰۸) "جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر اول روز سے پڑی ہے، وہ (واقعی) اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں" سے کونسی مسجد مراد ہے؟ اس سلسلہ میں دو حضرات کے درمیان بحث ہوگئی، ایک کا کہنا تھا کہ اس سے مسجد قبا مراد ہے، دوسرے کا دعویٰ تھا کہ مسجد نبوی مراد ہے، دونوں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا، آپ نے فرمایا: مسجد نبوی مراد ہے۔(۱)

(ز) کبھی قرآن مجید میں ایک حکم "عام" ذکر کیا جاتا ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں ہے؛ بلکہ بعض افراد اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جیسے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ۔ (النساء:۱۱)

اللہ تم لوگوں کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔

یہ حکم بہ ظاہر تمام اولاد کے لئے عام ہے؛ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مورث کا قاتل وارث نہیں ہوگا، (۲) اور کافر وارث نہیں ہوگا۔(۳)

(ح) کبھی قرآن مجید میں ایک حکم مطلق ذکر کیا جاتا ہے، حدیث سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس حکم کے ساتھ بعض قیود بھی ملحوظ ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا۔ (المائدۃ:۳۸)

چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

---

(۱) ترمذی، باب ماجاء فی المسجد الذی اسس علی التقوی، حدیث نمبر: ۳۲۳۔

(۲) ترمذی، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل، حدیث نمبر: ۲۱۰۹۔

(۳) ترمذی، کتاب الفرائض، حدیث نمبر: ۲۱۰۷۔

یہاں مطلق ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ گٹّے سے بھی ہوسکتا ہے، کہنی سے بھی اور مونڈھے سے بھی؛ لیکن حدیث نے واضح کردیا کہ یہاں گٹّے سے ہاتھ کاٹنا مراد ہے۔(۱)

(ط) بعض دفعہ قرآن مجید میں ایک لفظ مبہم ذکر کیا گیا ہے، جس کے معنی واضح نہیں ہیں، آپ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اس کو واضح فرمادیا۔

● قرآن مجید میں فرمایا گیا:

إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوداً۔ (الاسراء:۷۸)

بے شک صبح کی نماز حضوری کا وقت ہے۔

اس میں ''مشہود'' سے کیا مراد ہے؟ یہ واضح نہیں ہے، حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا: ''**تشهده ملائكة الليل وملائكة النهار**''(۲) یعنی ''فجر کے وقت رات اور دن دونوں کے فرشتے حاضر رہتے ہیں''۔

● اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحْمُوداً۔ (الاسراء:۷۹)

عجب کیا ہے کہ آپ کا پروردگار آپ کو مقامِ محمود میں جگہ دے؟

حدیث سے معلوم ہوا کہ ''مقامِ محمود'' سے ''شفاعت'' مراد ہے،(۳) یعنی قیامت میں آپ ﷺ کو شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

(ی) قرآن مجید میں عملی زندگی سے متعلق بیشتر احکام اجمالاً دیئے گئے ہیں، حدیث کے ذریعہ ان کی وضاحت ہوتی ہے، جیسے:

● **اقيموا الصلوٰة** (نماز قائم کرو)۔
● **آتوا الزكوٰة** (زکوٰۃ ادا کرو)۔
● **حج البيت** (بیت اللہ کا حج تم پر فرض ہے)۔

---

(۱) السنن الکبریٰ، کتاب السرقۃ، باب السارق یسرق، حدیث نمبر: ۱۷۰۲۵۔
(۲) ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۳۱۳۵۔
(۳) ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۳۱۳۷۔

میں نماز، زکوۃ، حج وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے، مگر قرآن مجید میں اس کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے، حدیثیں ان عبادات کی پوری کیفیت کو واضح کرتی ہیں۔

(ک) بعض واقعات قرآن مجید میں اختصار کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں، حدیث میں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے :

- حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ۔(۱)
- اصحاب اخدود کا واقعہ، جو سورۂ بروج میں آیا ہے۔(۲)
- واقعہ معراج، جس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کے بالکل شروع میں ہے۔(بنی اسرائیل:۱)

(ل) بعض اوقات حدیث سے قرآن مجید میں مذکور کسی حکم کے منسوخ ہونے کا علم ہوتا ہے، جیسے :

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِيْنَ ۔ (البقرۃ:۱۸۰)

تو تم پر والدین اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طریقہ پر وصیت کرنا فرض ہے۔

حدیث نے واضح کر دیا کہ یہ حکم منسوخ ہے اور ورثہ کے لئے وصیت کا اعتبار نہیں ہے:

"لا وصية لوارث"۔(۳)

تمرینی سوالات

(۱) تفسیر قرآن کے کیا کیا ماخذ ہیں؟

(۲) تفسیر قرآن بالقرآن کی درج ذیل صورتوں کو مثال سے واضح کیجئے :

(الف) لفظ مشترک کے معنی کی تعیین۔

(ب) مطلق کی تقیید۔

---

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، باب اذ قال موسیٰ لفتاہ الخ، حدیث نمبر:۴۷۲۵-۴۷۲۶۔

(۲) مسلم، کتاب الزہد والرقائق، باب قصۃ اصحاب الاخدود الخ، حدیث نمبر:۳۰۰۵۔

(۳) ترمذی، کتاب الوصایا، باب ماجاء لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر:۲۱۲۱۔

(ج) عام کی تخصیص۔

(د) وقت کی تعیین۔

(۳) حدیث، قرآن مجید کی شارح ہے، اس سلسلے میں قرآن کی کوئی آیت پیش کیجئے؟

(۴) حدیث سے کس کس طور پر الفاظِ قرآن کی وضاحت ہوتی ہے، اس کو لکھتے ہوئے کم سے کم اس کی ایک مثال بھی لکھئے۔

(۵) حدیث کے ذریعہ تفسیر قرآن کی درج ذیل صورتوں کو مثال سے واضح کیجئے۔

(الف) عام کی تخصیص۔

(ب) مطلق کی تقیید۔

(ج) مبہم کی توضیح۔

(د) مجمل کی تفسیر۔

(ہ) نسخ کی وضاحت۔

آثارِ صحابہ

پوری اُمت میں صحابہ کوفہم قرآن کے اعتبار سے تین ایسی خصوصیتیں حاصل ہیں، جن میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں، اول: یہ کہ انھوں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے قرآن مجید سنا بھی تھا اور سمجھا بھی تھا، نیز جہاں کہیں ان کو اشکال پیش آیا، انھوں نے آپ سے دریافت کرکے اپنی تشفی بھی کی تھی، دوسرے: قرآن مجید ان کے سامنے نازل ہوا؛ اس لئے وہ نزول آیات کے پس منظر سے واقف تھے، وہ واقعات وحالات ان کے سامنے تھے، جن کی بنا پر بعض آیات نازل ہوئیں اور جن کو ان آیات کا معنی ومقصد متعین کرنے میں بڑی اہمیت حاصل ہے، تیسرے: ہر زبان میں الفاظ کا استعمال بدلتا رہتا ہے، یہ تبدیلی زمان ومکان کی تبدیلی سے بھی آتی ہے اور قبائل کے لب ولہجہ کے فرق سے بھی؛ چوں کہ صحابہ قرآن مجید کے اولین مخاطب تھے؛ اس لئے قرآن مجید ان کی لغت میں نازل ہوا تھا اور وہ پوری طرح اس کے مفردات سے واقف تھے؛ اسی لئے تفسیر کا ایک اہم ماخذ آثار صحابہ کو مانا گیا ہے۔

صحابہ کی تفسیر و وضاحت مختلف جہتوں سے قرآن مجید کو سمجھنے میں مدد و معاون ہے :

(الف) قرآن مجید کے بعض مضامین میں بہ ظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، صحابی کی تفسیر اس تعارض کو دور کرتی ہے، جیسے :

● ایک صاحب نے حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کے سامنے چند اشکالات پیش کئے، ان میں دو یہ تھے کہ ایک طرف قرآن مجید کا بیان ہے کہ قیامت کے دن کوئی رشتہ باقی نہیں رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے دریافت حال کرسکیں گے: ''فَلَآ أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُوْنَ'' (مومنون:۱۰۱) دوسری طرف فرمایا گیا: وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے: ''وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَاءَلُوْنَ'' (الصافات:۲۷) حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ مومنون کی آیت کا تعلق پہلی بار صور پھونکے جانے سے ہے اور دوسری آیت کا تعلق دوسری بار صور پھونکے جانے کے بعد سے —— دوسرا سوال یہ تھا کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن لوگ سچائی کو چھپا نہیں سکیں گے: ''وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا'' (النساء:۴۲)، دوسری طرف فرمایا گیا کہ قیامت کے دن مشرکین کہیں گے: ہم شرک نہیں کیا کرتے تھے: ''رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ'' (الانعام:۲۳) حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ نے فرمایا کہ جب مشرکین دیکھیں گے کہ اللہ ایمان والوں کو معاف کررہے ہیں تو کہیں گے کہ ہم شرک نہیں کیا کرتے تھے، پھر ان کی زبان پر مہر لگادی جائے گی اور اعضاء بولنے لگیں گے، تو اب وہ کوئی سچائی چھپا نہیں سکیں گے —— اس طرح کے متعدد اشکالات تھے، جن کو حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ نے حل کیا۔(۱)

(ب) بعض آیات کے مفہوم میں ابہام ہے، صحابہ کے اقوال سے اس کی وضاحت ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَقَدْ رَأٰى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔ (النجم:۱۸)

اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

---

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، باب سورۃ اذا الشمس کورت۔

——حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ سے روایت ہے کہ اس سے 'سبز رفرف' مراد ہے، جس نے پورے اُفق کو گھیر لیا تھا: ''رأی رفرفا اخضر قد سد الافق''۔(۱)

● **فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى ، فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۔** (النجم:۹-۱۰)

یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا، تب اس نے اللہ کے بندے پر جو وحی پہنچانی تھی پہنچائی۔

——حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد حضرت جبرئیل کو ان کی اصل شکل میں دیکھنا ہے، جب کہ ان کو چھ سو پر لگے ہوئے تھے: ''**رأی جبریل له ست مائة جناح**''۔(۲)

(ج) بعض مفردات کی مراد صحابہ کے بیان سے معلوم ہوتی ہے، جیسے :

● قرآن مجید میں ہے :

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۔ (مرسلات:۳۲)

حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ سے منقول ہے کہ ہم لوگ تین تین ہاتھ یا اس سے بھی زیادہ لکڑیاں جمع کرتے تھے اور اس کو موسم سرما کے لئے محفوظ کردیتے تھے، اس کو ہم ''قصر'' کہتے تھے۔(۳)

● حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ نے ''**کاساً دھاقاً**'' کی مراد بتائی ہے کہ جام بھرا ہوا ہو اور مسلسل دیا جائے اور زمانۂ جاہلیت کی تعبیر سے استدلال کیا ہے۔(۴)

(د) قرآن مجید کی متعدد آیات ہیں، جن کا واقعاتی پس منظر صحابہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

---

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، باب لقد رأی من آیات ربہ الکبری، حدیث نمبر:۴۸۵۸۔

(۲) بخاری، کتاب التفسیر، باب فکان قاب قوسین أو أدنی، حدیث نمبر:۴۸۵۶۔

(۳) بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ، حدیث نمبر:۴۹۳۲۔

(۴) بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاہلیت، حدیث نمبر:۳۸۳۹۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ ۔ (۱)

تم پر (حج کے موقعہ سے) اپنے رب کا فضل تلاش نے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

— حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ عُکاظ، مَجنہ اور ذُوالمجاز کے بازار زمانۂ جاہلیت میں لگا کرتے تھے، ان بازاروں میں خلاف شرع کام بھی ہوتے تھے؛ اس لئے صحابہ کو تامل ہوا کہ کیا وہ ان بازاروں میں تجارت کر سکتے ہیں؟ اسی سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں۔(۲)

● ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ ۔ (البقرۃ:۱۹۹)

پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو۔

حضرت عائشہ ﷺ سے روایت ہے کہ قریش حج میں عرفات نہیں جاتے تھے، مزدلفہ ہی میں قیام کرتے تھے، یعنی حدود حرم سے باہر جانے کو اپنی شان کے خلاف تصور کرتے تھے، دوسرے حجاج عرفات بھی جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی اس بے جا رسم کو ختم کر دیا اور اس آیت میں حکم دیا گیا کہ جیسے دوسرے لوگ عرفات جا کر واپس آتے ہیں تم بھی عرفات جا کر واپس آجاؤ۔(۳)

(ہ) قرآن مجید کی تعبیر سے بہ ظاہر بعض احکام کے صرف جائز ہونے کا گمان ہوتا ہے، صحابہ نے اس کا جو پس منظر نقل کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ظاہری معنی مراد نہیں ہے، جیسے:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۔ (۴)

---

(۱) البقرۃ:۱۹۸۔

(۲) بخاری، کتاب التفسیر، باب لیس علیکم جناح الخ، حدیث نمبر: ۴۵۱۹۔

(۳) بخاری، کتاب التفسیر، باب ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ، حدیث نمبر: ۴۵۲۰۔

(۴) البقرۃ:۱۵۸۔

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے؛ اس لئے جو شخص
حج یا عمرہ کرے، اس پر ان دونوں کی سعی کرنے میں مضایقہ نہیں۔

''لا جناح'' کی تعبیر عام طور پر جواز کے لئے استعمال ہوتی ہے؛ اس لئے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان ''سعی'' ضروری نہیں ہے، صرف جائز ہے؛ لیکن حضرت عائشہ ؓ کی روایت واضح کرتی ہے کہ ایسا نہیں ہے اور یہاں ''لا جناح'' کی تعبیر اس پس منظر میں ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں صفا و مروہ پر بت رکھے ہوئے تھے، لوگ سعی کرتے ہوئے ان کی عبادت کا تصور رکھتے تھے، فتح مکہ کے بعد اگر چہ یہ بت گرا دیئے گئے، مگر پھر بھی صحابہ کو اس قدیم نسبت کی وجہ سے کراہت ہوتی تھی، اس پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی۔(۱)

- **لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا۔** (النساء:۱۰۱)

تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو، اگر تم کو اندیشہ ہے کہ کفار تم کو ستائیں گے۔

اس آیت کی ظاہری تعبیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یعلی بن امیہ نے حضرت عمر ؓ سے سوال کیا کہ اب تو لوگ امن کی حالت میں ہیں؟ حضرت عمر ؓ نے کہا کہ یہی خیال مجھے بھی ہوا تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تم پر اللہ کی طرف سے صدقہ ہے؛ اس لئے اللہ کے صدقہ کو قبول کرو،(۲) یعنی یہ حکم تو فتنہ کے زمانہ میں دیا گیا تھا؛ لیکن زمانۂ امن میں بھی یہی حکم باقی ہے۔

(و) قرآن مجید کے بعض احکام بہ ظاہر عام معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن صحابی رسول کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مراد خاص ہے، جیسے:

- **يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا۔** (آل عمران:۱۸۸)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر:۱/۴۴۸۔

(۲) مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب صلوٰۃ المسافرین وقصرہا، حدیث نمبر:۶۸۶۔

جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ
انھوں نے نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو۔

مروان نے حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ سے دریافت کیا کہ اس آیت کی رو سے تو ہم سب عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے، عبداللہ بن عباس ﷺ نے فرمایا: اس کا تعلق یہودیوں سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان سے بعض باتوں کے بارے میں دریافت فرمایا، انھوں نے سچائی کو چھپایا اور بدل کر جواب دیا، ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ سچائی کو چھپانے اور غلط بیانی کرنے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس جواب پر ان کو شاباشی دی جائے،(۱) —— غرض کہ آیت کا مضمون عام نہیں ہے؛ بلکہ یہودیوں کے لئے خاص ہے۔

● حضرت ابو سلمہ ﷺ سے روایت ہے کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کے پاس آئے، وہیں حضرت ابو ہریرہ ﷺ بھی بیٹھے ہوئے تھے، ان صاحب نے دریافت کیا: جس عورت کو شوہر کی وفات کے چالیس دنوں بعد ولادت ہو، اس کے لئے کیا حکم ہے؟ ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ ولادت اور چار ماہ دس دنوں میں سے جو لمبی مدت ہو، وہ اس کی عدت ہوگی، حضرت ابو سلمہ ﷺ نے کہا کہ ولادت پر اس کی عدت پوری ہو جائے گی، حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا: میری بھی یہی رائے ہے، حضرت ابن عباس ﷺ نے اپنے غلام ''کریب'' کو حضرت اُم سلمہ ﷺ کے پاس بھیجا، اُم المومنین نے فرمایا کہ سبیعہ اسلمیہ کے شوہر قتل کر دیئے گئے؛ جب کہ وہ حمل کی حالت میں تھیں، وفات کے چالیس دنوں بعد ان کو ولادت ہوئی، پھر جلد ہی ان کے لئے نکاح کا پیغام آیا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کا نکاح کر دیا،(۲) —— معلوم ہوا کہ سورۂ بقرہ ۲۳۴ کا حکم عام نہیں ہے؛ بلکہ حاملہ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(ز) بعض دفعہ قرآن مجید میں افراد یا گروہ کا مبہم ذکر کیا گیا ہے، صحابہ کے اقوال سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

(۱) بخاری کتاب التفسیر، باب واولات الاحمال اجلھن الخ، حدیث نمبر: ۴۹۰۹۔
(۲) بخاری، کتاب التفسیر، باب واولات الاحمال اجلھن الخ، حدیث نمبر: ۴۹۰۹۔

• إِن تَتُوبَا إِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيرٌ ۔ (التحریم:۴)

اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہو) ؛

کیوں کہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور اگر نبی کے

مقابلہ میں تم نے باہم جتھ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ ان کا مولیٰ

اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ نے اس سلسلہ میں حضرت عمر ﷺ سے دریافت فرمایا، تو فرمایا: عائشہ وحفصہ مراد ہیں، رضی اللہ عنہما۔ (۱)

• هٰذَانِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ ۔ (الحج:۱۹)

یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملہ میں جھگڑا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری ﷺ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جو غزوۂ بدر میں ایک دوسرے کے مدمقابل معرکہ آراء ہوئے تھے، یعنی مسلمانوں کی طرف سے حضرت علی، حضرت حمزہ اور عُبیدہ بن حارث ﷺ، مشرکین مکہ کی طرف سے عُتبہ، شیبہ اور ولید بن عقبہ۔ (۲)

(ج) کبھی صحابہ کے بیان سے کسی حکم کا منسوخ ہونا معلوم ہوتا ہے، جیسے :

• وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۔ (۳)

حضرت سلمہ بن اکوع ﷺ سے روایت ہے کہ روزہ فرض ہونے کے بعد ابتداء میں گنجائش رکھی گئی تھی کہ جو روزہ نہیں رکھنا چاہیں، وہ فدیہ ادا کردیا کریں، پھر بعد میں یہ حکم منسوخ

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، باب وإذ أسر النبي ...... إلی بعض ازواجہ، حدیث نمبر: ۴۹۱۴۔

(۲) بخاری کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل، حدیث نمبر: ۳۹۶۸۔

(۳) البقرۃ: ۱۸۴۔

کر دیا گیا،(۱) حضرت عبداللہ بن عمر ﷛ نے بھی اس آیت کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے۔(۲)

● وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجاً يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۔(۳)

اور تم میں سے جن لوگوں کی وفات ہوجائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں، وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دنوں تک روکے رکھیں، پھر جب یہ اپنے عدت پوری کرلیں تو وہ اپنی ذات کے بارے میں درست طریقے پر جو بھی قدم اُٹھائیں (اے بیوہ عورتوں کے اولیاء!) تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں اور تم جو بھی عمل کرتے ہو، اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عثمان غنی ﷛ سے مروی ہے کہ اس آیت سے سورۃ بقرہ کی آیت نمبر: ۲۴۰ منسوخ ہے، جس میں عدت وفات کی مدت ایک سال مقرر کی گئی ہے۔(۴)

تفسیر صحابہ کا حکم

صحابہ کے تفسیری اقوال کی حیثیت کیا ہوگی؟ —— اس سلسلہ میں اہل علم کی بحث کا حاصل یہ ہے:

(الف) جس بات میں نہ اجتہاد کا دخل ہو نہ مفردات قرآن سے واقفیت کا، یعنی اس کی بنیاد لغت و زبان پر بھی نہ ہو، وہ ''حدیث نبوی'' کے درجہ میں ہے؛ کیوں کہ ضرور

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، باب فمن شہد منکم الشہر الخ، حدیث نمبر: ۴۵۰۷۔

(۲) حوالۂ مذکورہ، حدیث نمبر: ۴۵۰۶۔

(۳) البقرۃ: ۲۳۴۔

(۴) بخاری، کتاب التفسیر، باب والذین یتوفون منکم الخ، حدیث نمبر: ۴۵۳۰۔

انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہی یہ بات فرمائی ہوگی — جیسے: ماضی کی خبریں، مستقبل کی پیشین گوئیاں، جنت ودوزخ کی صفات، ثواب وعقاب، وغیرہ — البتہ جن صحابہ کے بارے میں معلوم ہو کہ سابق آسمانی کتابوں سے بھی وہ واقف تھے، ماضی کے احوال سے متعلق ان کی وہ روایات 'حدیث' کے درجہ میں نہیں ہیں، جن کا ذکر تورات وانجیل میں آیا ہے۔

(ب) جن مسائل کے بارے میں صحابہ کی تفسیر منقول ہے، ان میں اجتہاد کا یا لغت وزبان کا دخل تو ہے؛ لیکن اُمت نے اس کو بالاتفاق قبول کرلیا ہے تو یہ بھی 'اجماع' منعقد ہونے کی وجہ سے حجت ہے۔

(ج) جن اُمور میں اجتہاد ورائے کا دخل ہے، یا زبان ولغت سے تعلق ہے، یا گذشتہ آسمانی کتابوں میں بھی اس طرح کا مضمون آیا ہے اور ان صحابی کا سابق آسمانی کتابوں سے بھی تعلق رہا ہے، ان کے تفسیری اقوال حدیث کے درجہ میں نہیں ہیں۔

عربی زبان ولغت

آخری آسمانی کتاب قرآن مجید کے لئے اللہ تعالیٰ نے جس زبان کا انتخاب فرمایا ہے، وہ ''عربی'' ہے:

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ (الزخرف:۳)

ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے؛ تاکہ تم لوگ سمجھو۔

کیوں کہ یوں تو قرآن مجید کی مخاطب قیامت تک آنے والی پوری انسانیت ہے؛ لیکن اس کتاب کے اولین مخاطب ''عرب'' تھے، اس لئے جن الفاظ کو شرعی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہو، جیسے: صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق، وراثت، وصیت، رسالت، ملائکہ وغیرہ، ان کو چھوڑ کر قرآن مجید میں جو بھی الفاظ وارد ہوئے ہیں، ان کا وہی مفہوم ہوگا، جو عربی زبان میں استعمال ہوتا رہا ہے اور جو معنی عربوں میں معروف رہا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْناً ۔ (البقرۃ:۶۰)

پتھر پر اپنی لاٹھی مارو؛ چنانچہ اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

''ضرب'' کا صلہ اگر ''ب'' ہو تو اس کا معنی ''مارنے'' کے ہیں، اگر ''فی'' ہو تو ''چلنے'' کے معنی لئے جاتے ہیں، مگر قرآن مجید کے بعض اُردو مترجمین نے معتزلہ کی تفسیر کو قبول کرتے ہوئے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھیں تو بارہ چشمے بہتے ہوئے نظر آئیں گے'' یہ ترجمہ عربی لغت کے بالکل خلاف اور نامعتبر ہے۔

عربی زبان کے بھی اسی معنی کا اعتبار ہوگا، جو نزولِ قرآن مجید کے وقت مروج تھا اور صحابہ اس لفظ سے وہ معنی سمجھتے تھے، اگر بعد کو یہ لفظ کسی اور معنی میں استعمال ہونے لگے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، جیسے :

- صدقہ : قرآن مجید میں یہ لفظ اعانت وتبرع کے عمومی معنی میں استعمال ہوا ہے، جس میں زکوۃ بھی شامل ہے؛ لیکن بعد کو فقہ کی اصطلاح میں ''زکوۃ'' کو چھوڑ کر صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کے معنی میں اس کا استعمال ہونے لگا۔
- فرض : فقہ کی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے ضروری احکام کے لئے بولا جاتا ہے، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت الفاظ سے ثابت ہوں؛ لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ مقرر کرنے وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اکثر گمراہ فرقوں نے قرآن مجید کو اپنی سوچ کے مطابق ڈھالنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ عربی الفاظ کو اس کے معروف اور صحابہ کے عہد میں مروج معنوں سے ہٹا کر نیا معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہاں اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

- **مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ ۔** (الاحزاب:۴۰)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

''ختم'' کے معنی مہر بند کردینے کے ہیں، یعنی کسی چیز کو اس طرح بند کر دیا جائے کہ باہر کی کوئی چیز اندر داخل نہ ہو سکے؛ لہٰذا مطلب یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت آپ پر مکمل ہو گیا ہے، اب قصرِ نبوت میں کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا، اس لفظ کی یہ مراد اس درجہ واضح ہے کہ عہدِ نبوی میں جن کذّاب لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، انھوں نے بھی یہ تو کہا کہ مجھ پر فرشتہ وحی لے کر آیا ہے؛ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ میری نبوت محمد ﷺ کی مہر سے جاری ہوئی ہے، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کیا؛ کیوں کہ وہ لوگ عربی زبان سے واقف تھے اور یہ شخص عربی زبان کے اُسلوبِ بیان سے بھی نابلد تھا۔

● إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۔ (الشعراء:۱۵۳)

تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔

قادیانیوں نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :

سحر کے معنی کھانا دیئے جانے کے بھی ہوتے ہیں، تقریباً ہر نبی جو دنیا میں آیا ہے، اسے کہا گیا ہے کہ تو مسحر یا مسحور ہے، یعنی کچھ لوگ تجھے رشوت دے کر اپنے کام میں لا رہے ہیں۔ (تفسیر صغیر:۴۷۷)

حالاں کہ عربی زبان میں ''سحر'' کے معنی کھانا دیئے جانے کے نہیں ہیں، یہ محض دھوکہ ہے؛ چوں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکا؛ اس لئے قرآن مجید میں جہاں بھی معجزات یا فوق العادۃ واقعات کا ذکر آیا ہے، قادیانی اسی طرح اس کی تاویل کرتے ہیں۔

● إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۔ (القیامۃ:۱۶-۱۸)

اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے؛ لہٰذا ہم جب اسے پڑھ رہے ہوں، اس وقت تم اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

''ثم'' کے معنی کسی چیز کے ''تراخی'' یعنی تھوڑی تاخیر کے ساتھ بعد میں ہونے کے

آتے ہیں، اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ہم آپ کے سینۂ مبارک میں قرآن مجید کو محفوظ بھی کر رہے ہیں اور پھر اس کی تشریح و توضیح بھی آپ کو بتائیں گے؛ کیوں کہ آپ کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہی قرآن کا بیان ہے، (النحل:۴۴) مگر مہدوی حضرات نے ''ثم'' کے لفظ کی یہ تفسیر کی کہ ایک ہزار سال کے بعد سید محمد جونپوری پر معانی قرآن کا نزول ہوا، گویا ان کے خیال کے مطابق ایک ہزار سال تک قرآن مجید کے معانی و مطالب سے مسلمان بے خبر رہے، اس کا غلط اور خلاف عقل ہونا ظاہر ہے — یا جیسے: ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' (البقرۃ:۲) میں ''ہدیٰ'' سے مہدی مراد لینا اور اس کو ''المهدى للمتقين'' کا ہم معنی قرار دینا۔ (نور ایمانی)

● فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ (النساء:۳)

تو جو عورتیں پسند ہوں، ان سے نکاح کرلو، دو دو، تین تین، چار چار۔

عربی زبان کے عرف کے لحاظ سے اس آیت میں زیادہ سے زیادہ چار نکاح کی اجازت دی گئی ہے، مگر بعض منحرف افکار کے حاملین نے اس سے نو شادیوں تک کی اجازت کا معنی اخذ کیا ہے، جو عربی لغت کی رو سے بالکل غلط ہے۔

● حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ۔ (۱)

تم پر مردار، خون اور سور کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔

بعض گمراہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ خنزیر کا صرف گوشت حرام ہے، چربی نہیں؛ لیکن عربی زبان کی رو سے یہ بالکل غلط ہے، عربی زبان میں ''لحم'' کا اطلاق ''شحم'' (چربی) پر بھی ہوتا ہے۔

● وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (البقرۃ:۲۴۱)

اور مطلقہ عورتوں کے لئے رواج کے مطابق متاع ہے۔

''متاع'' کا ترجمہ بعض انگریزی مترجمین نے Maintanance (نفقہ) سے کر دیا ہے، اس کی وجہ سے ہندوستان کی سپریم کورٹ نے فیصلہ کر دیا کہ مطلقہ کو تا وفات یا تا نکاح ثانی نفقہ

---

(۱) المائدۃ:۳۔

ادا کرنا ہوگا؛ حالاں کہ عربی زبان میں ''متاع'' تحفہ یا رخصتانہ کو کہتے ہیں، جو ایک دفعہ دیا جاتا ہے، نہ کہ نفقہ کو، جو بار بار اور مسلسل دیا جاتا ہے۔

● عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض دفعہ کلمات قرآنی کی ایسی تشریح کی جاتی ہے، جو ایک لطیفہ سے کم نہیں، جیسے :

يَوْمَ نَدْعُوْ كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۔ (الاسراء:۷۱)

جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے رہنما کے ساتھ بلائیں گے۔

امام کے معنی سردار اور قائد کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگ اپنے مقتدیٰ کے ساتھ بلائے جائیں گے، مگر بعض لوگوں نے خیال کیا کہ ''امام'' اُم (ماں) کی جمع ہے اور مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا۔

تمرینی سوالات

(۱) آثارِ صحابہ کو تفسیر قرآن مجید میں کیوں خصوصی اہمیت حاصل ہے؟

(۲) آثارِ صحابہ سے تشریح قرآن کی درج ذیل صورتوں کو مثالوں سے واضح کیجیے :

(الف) دفعِ تعارض۔

(ب) مبہم کی تفسیر۔

(ج) مفردات کی مراد۔

(د) واقعاتی پس منظر۔

(ہ) تخصیص عام۔

(و) نسخ آیات۔

(۳) تفسیر صحابہ کا کیا حکم ہے؟

(۴) تفسیر قرآن میں عربی زبان ولغت سے کس طرح مدد لی جاسکتی ہے اور فرقِ باطلہ پر رد کیا جاسکتا ہے؟ چند مثالوں سے واضح کیجیے۔

تفسیر بالرائے

غور و تامل سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ ''رائے'' ہے؛ چنانچہ اگر انسان قرآن مجید کے مقصود و مطلوب تک پہنچنے کے لئے غور و فکر کرے اور تفسیر قرآن مجید کے جو وسائل ہیں، ان کے ذریعہ کسی نتیجہ تک پہنچے تو وہ رائے ''محمود'' (پسندیدہ) ہے اور سلف صالحین کی کوئی تفسیر اس سے خالی نہیں، اور اگر انسان نے پہلے سے کوئی رائے قائم کر لی، جو کتاب و سنت کی عام تعلیمات، شریعت کے عمومی مزاج و مذاق اور سلف صالحین کے متفقہ اور متوارث فکر و عمل کے مغائر ہو اور بہ تکلف قرآن مجید سے اسے ثابت کیا جائے تو ایسی رائے ''مذموم'' (ناپسندیدہ) ہے اور اسی طرح کی تشریح کو ''تفسیر بالرائے'' کہتے ہیں، جس کی حدیث میں مذمت کی گئی ہے۔

تفسیر بالرائے کی چند مثالیں اس طرح ہیں :

● روافض کا کہنا کہ آیت قرآنی :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيباً مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ۔ (النساء:۵۱)

آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب (الٰہی) کا کچھ حصہ دیا گیا؟ وہ بتوں پر اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

— میں نعوذ باللہ ''جبت و طاغوت'' سے حضرت ابوبکر و عمرؓ مراد ہیں۔

● إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً۔ (البقرۃ:۶۷)

اللہ تم کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

میں ''بقرہ'' سے نعوذ باللہ بعض شیعہ مفسرین کا حضرت عائشہؓ کو مراد لینا۔

● اللهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ۔ (الزمر:۶۲)

اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

سے معتزلہ کا یہ معنی اخذ کرنا کہ قرآن مجید بھی مخلوق ہے۔

● ارْكُضْ بِرِجْلِكَ ۔ (ص:۴۲)

اپنا پاؤں زمین پر مار۔

سے بعض صوفیاء کا رقص کے جواز پر استدلال کرنا۔

● كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۔ (الاعراف:۱۶۶)

ذلیل بندر بن جاؤ۔

کو ''مسخ'' کا عذاب تسلیم کرنے کی بجائے یہ کہنا کہ اللہ نے ان سے فرمایا تھا: ''بندر کی طرح ذلیل ورسوا ہو جاؤ''۔

یوں تو ہر عہد میں فرق باطلہ نے اپنے فاسد خیالات کو ثابت کرنے کے لئے تفسیر بالرائے کا ارتکاب کیا ہے؛ لیکن خاص کر معتزلہ اور شیعہ نے اس پہلو سے بڑا نقصان پہنچایا ہے، واللہ ہو الہادی۔

گذشتہ آسمانی کتابیں

قرآن مجید کا ایک اہم مضمون گذشتہ انبیاء اور ان کی قومیں ہیں، قرآن مجید میں انبیاء بنی اسرائیل اور ان سے پہلے کے پیغمبروں کے قصص وواقعات اور اپنی قوم سے ان کے مذاکرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، ان واقعات کا ذکر سابقہ مذہبی کتابوں میں موجود ہے، ان کتابوں میں تورات، زبور اور انجیل کی صراحتاً؛ لیکن اجمالی طور پر تصدیق کی گئی ہے، اجمالی تصدیق سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ آسمانی کتابیں پوری طرح اپنی اصل حالت میں موجود نہیں ہیں؛ بلکہ ان میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے اور معنوی ردوبدل بھی ہوا ہے؛ اس لئے ان کتابوں سے قرآنی قصص کو سمجھنے میں خاص طور پر مدد ملتی ہے؛ مگر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ خالص اور کھوٹ کا فرق باقی رہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیلی روایات کے تفسیری ذخیرہ میں داخل ہو جانے کی وجہ سے کافی نقصان بھی پہنچا ہے؛ کیوں کہ بعض اسرائیلی روایات اسلام کے بنیادی افکار وتصورات کے مغائر ہیں، مثلاً: اسلام کی نظر میں انبیاء معصوم ہیں؛ کیوں کہ وہ اپنی قوم کے لئے اُسوہ ونمونہ

کا درجہ رکھتے ہیں؛ لیکن بائبل میں مختلف پیغمبروں ''حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت داود، حضرت سلیمان'' وغیرہ کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، وہ انتہائی ناشائستہ؛ بلکہ بے ہودہ ہے۔

گذشتہ آسمانی کتابوں اور قرآن مجید کے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ متعدد اُمور کے سلسلہ میں قرآن نے بائبل کے بیان کی تصحیح کی ہے اور جو غلط فہمی بائبل کے بیان سے پیدا ہو سکتی تھی، اس کو دور کیا ہے۔

بائبل میں حضرت داود اور حضرت سلیمان ﷺ کو غلط کار ٹھہرایا گیا ہے، یہاں تک کہ حضرت سلیمان ﷺ کو کفر کا مرتکب قرار دیا گیا ہے، (۱) — اس پس منظر میں قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا ۔ (البقرۃ:۱۰۲)

اور سلیمان نے کفر نہیں کیا؛ لیکن شیاطین نے کفر کیا۔

بائبل میں جنت میں ہونے والی لغزش کو حضرت حوا ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، (۲) اسی وجہ سے یہودی و عیسائی مذہب میں عورت کو گناہ کا دروازہ سمجھا گیا، قرآن نے حضرت آدم و حوا ﷺ دونوں کی طرف لغزش کی نسبت کی ہے :

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۔ (۳)

آخر شیطان نے اسی درخت کے باعث ان دونوں کو لغزش میں مبتلا کیا اور اس سے ان کو نکال کر ہی چھوڑا۔

اور چوں کہ بہ حیثیت مرد ''حضرت آدم ﷺ'' پر اس لغزش سے بچنے کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی؛ اس لئے کہیں صرف ان کی طرف اس بھول چوک کی نسبت کی گئی :

وَعَصَىٰ اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۔ (طٰہٰ:۱۲۱)

اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔

---

(۱) اسلاطین ۱:۱-۴۔ (۲) پیدائش: ۱/۳-۶۔ (۳) البقرۃ: ۳۶۔

اس طرح عورتوں پر سبب گناہ ہونے کا جو داغ لگا تھا، قرآن مجید نے اس کو دھو دیا۔

بائبل میں تخلیق کائنات کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں کائنات کو پیدا کیا اور پھر ایک دن آرام کیا، (۱) گویا خدا کو بھی تکان ہوتی ہے اور آرام کی ضرورت پڑتی ہے، قرآن مجید کا بیان ہے :

وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ ۔ (ق:۳۸)

ان اُمور کو سامنے رکھتے ہوئے اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں جمہور کا تصور یہ ہے کہ :

(الف) بائبل کی جو باتیں قرآن وحدیث کے مطابق ہیں، وہ قبول کی جائیں گی۔

(ب) بائبل کی جو باتیں قرآن وحدیث کے بیان کے خلاف یا اسلام کے بنیادی تصورات سے متصادم ہیں، ان کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

(ج) جن باتوں کی نہ قرآن وحدیث سے تصدیق ہوتی ہو نہ تکذیب، اور نہ وہ اسلامی تصورات سے متصادم ہوں، تو ان کے بارے میں سکوت وتوقف اختیار کیا جائے گا؛ البتہ سابقہ کتب آسمانی کے حوالہ سے ان کو نقل کرنا جائز ہوگا — اسرائیلی روایات کے بارے میں ان اُصولوں کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے ان دو ارشادات پر ہے :

- **لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوا هم ۔** (۲)

اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔

- **حدثوا عن بني اسرائيل ولا حرج ۔** (۳)

بنی اسرائیل کی باتیں بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

تفسیر کی شرطیں

قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی تفسیر بڑی ذمہ داری کا کام ہے؛ کیوں کہ اس کی نسبت

---

(۱) پیدائش:۲:۲۔

(۲) بخاری، کتاب الشهادات، باب لا يسأل اهل الشرك الخ، حدیث نمبر: ۲۶۸۵۔

(۳) بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۴۶۱۔

اللہ تعالیٰ کی طرف ہے؛ اس لئے علماء نے تفسیر قرآن کے لئے کچھ شرطیں ذکر کی ہیں، جو لوگ ان کے حامل نہ ہوں، ان کے لئے قرآن مجید کی کسی تفسیر کو سنا دینا تو جائز ہے؛ لیکن خود تفسیر کرنا یا تفسیر لکھنا جائز نہیں، وہ شرطیں حسبِ ذیل ہیں :

(۱) قرآن مجید کا علم، اور ایک موضوع سے متعلق مختلف مقامات پر جو آیتیں آئی ہیں، ان سے واقف ہونا؛ کیوں کہ تفسیر قرآن کا سب سے بڑا ماخذ خود قرآن مجید ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قرآن کی تمام آیات پر انسان کی نظر ہو، اسی طرح قرآن مجید میں بعض احکام منسوخ بھی ہیں، یہ ضروری ہے کہ وہ منسوخ اور ناسخ احکام کا ادراک رکھتا ہو۔

(۲) احادیث اور آثارِ صحابہ سے واقفیت؛ کیوں کہ فہم قرآن مجید کے لئے دوسرا سب سے اہم ماخذ احادیث و آثار ہیں، احادیث ہی میں وہ مرویات بھی شامل ہیں، جو آیات کے اسبابِ نزول سے متعلق ہیں۔

(۳) عربی زبان سے اچھی طرح واقف ہونا، عربی زبان میں لغت بھی شامل ہے، نحو وصرف کے قواعد بھی شامل ہیں اور معانی و بلاغت کے اُصول بھی؛ کیوں کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے اور جب تک انسان ان علوم سے واقف نہیں ہوگا، وہ قرآن کے مفاہیم کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

(۴) قرآن مجید کی مختلف قراءتوں سے واقف ہونا؛ کیوں کہ قرآن کو سمجھنے میں اس کا بڑا دخل ہے، نیز بعض دفعہ ایک قراءت دوسری قراءت کو متعین کرنے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔

(۵) اُصولِ دین، یعنی اعتقادات اور خاص کر اہل سنت والجماعت کے فکری نقطۂ نظر سے واقف ہونا؛ تاکہ تفسیری اقوال میں صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کر سکے۔

(۶) اُصولِ فقہ میں گہری بصیرت رکھتا ہو؛ تاکہ قرآن مجید کے الفاظ سے صحیح معنی مستنبط کر سکے اور اپنے استنباط و اجتہاد میں الفاظ کے دائرے کو پیش نظر رکھے۔

(۷) وہ گذشتہ مفسرین کی تفسیری آراء سے بھی واقف ہو؛ تاکہ اجماعی اور اختلافی مسائل میں فرق کر سکے اور صحیح نتائج تک پہنچ سکے۔

(۸) ایک اہم شرط انسان کی عملی زندگی سے متعلق ہے کہ وہ اللہ کی خشیت رکھتا ہو، اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات پر پورا یقین ہو؛ تاکہ قرآن مجید کی تفسیر میں اپنی خواہشات کی پیروی اور بے جا تاویل وتشریح کا مرتکب نہ ہو جائے۔

جن علوم کو تفسیر قرآن مجید کے لئے شرط کا درجہ دیا گیا ہے، ضروری نہیں کہ وہ سب ہر وقت ذہن میں مستحضر ہوں؛ بلکہ یہ بات کافی ہے کہ اس کے اندر بوقت ضرورت ان علوم کی کتابوں سے مراجعت کی صلاحیت موجود ہو، جن لوگوں کی ظاہری زندگی یہ بتاتی ہے کہ وہ شریعت کی اطاعت اور سنت کی اتباع و پیروی سے دور ہیں، یا جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ عربی زبان سے بھی واقف نہ ہوں، نہ ان کے لئے جائز ہے کہ وہ تفسیر بیان کریں اور نہ دوسرے مسلمانوں کے لئے درست ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی تفسیر کو مستند اور معتمد سمجھ کر ان کی رائے کو قبول کریں۔

تمرینی سوالات

(۱) رائے محمود اور رائے مذموم سے کیا مراد ہے؟

(۲) رائے مذموم کی کم سے کم دو مثالیں دیجئے۔

(۳) گذشتہ آسمانی کتابوں سے قرآن مجید کی تفسیر میں کس طرح مدد لی جا سکتی ہے؟

(۴) قرآن مجید میں بائبل کے بعض بیانات کی تصحیح کی گئی، اس کی کم سے کم دو مثالیں دیجئے؟

(۵) تفسیر کے لئے کیا شرطیں ہیں، اس پر ایک نوٹ تحریر کریں۔

● ● ●